U26773 — 164-12

tle - TALISTAYEE KI KAHANIYAN

eator - TALISTAYEE ; Mutarjum Yazdani Jaland

blisher - Narain Dutt Sehgal And Sons (Lahor

ate - 1941

ges - 192

bjects - Roosi Adab - fiction ; Urdu Adab - Kahaniyan ; Talistayee.

RESERVE BOOK

ٹالسٹائی کی کہانیاں

از قلم

حضرت یزدانی جالندھری



پبلشرز

این دت سہگل اینڈ سنز تاجرانِ کتب لوہاری گیٹ لاہور

پہلی بار — مئی ۱۹۴۱ء — قیمت عہ

پنجاب آرٹ پریس بیرون موری گیٹ سرکلر روڈ لاہور میں باہتمام لالہ گلزار چند کپور چھپا اور لالہ بلراج سہگل مالک فرم نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری گیٹ لاہور سے شائع کیا۔



فہرس



آغاز

(حضرتِ قمر جلال آبادی)

مہاتما ٹالسٹائی کو روس کے ادب میں وہی درجہ حاصل ہے جو شیخ سعدی کو فارسی میں۔ دونوں اخلاقیات کے علمبردار تھے ـــــ سعدی کا انداز ناصحانہ تھا تو ٹالسٹائی کا فلسفیانہ ـــــ سعدی جس بات کو سیدھے سادے الفاظ میں کہہ دیتا تھا، ٹالسٹائی اسی کو افسانوی رنگ میں بیان کرتا تھا۔ ان دونوں کے تخیلات، احساسات اور نظریات اس قدر زندہ، اس قدر حقیقت پاش، اور اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ ان میں کہیں ان کے ملک کی مخصوص فضا کا تاثر نہیں بلکہ دنیا کے ہر گوشے میں ان کے احساسات کی حکمرانی ہے۔

مہاتما ٹالسٹائی نے یوں تو بہت کچھ لکھا ہے اور آج یورپ کی کوئی ایسی زبان نہیں جس میں اُن کے ادبی شاہکار منتقل نہ ہو چکے ہوں لیکن اواخر عمر میں جب ان کے ادبی اور مذہبی خیالات پختہ تر ہو گئے تھے تو انہوں نے اپنی ان کہانیوں کو اپنے تمام سرمایۂ ادب سے بلند ترین مقام دیا تھا۔ اینی کرنینا اور سیوسٹوپول وغیرہ ناول ان کی نظروں سے گر گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب کی بہترین خوبی قبولِ عام ہے اسکی زبان اور خیالات دونوں ایسے آسان ہونے چاہئیں کہ دیہات کے کسان بھی آسانی سے سمجھ سکیں۔ وہ مذہبی اصولوں کو ادب کا منتہائے مقصود مانتے تھے اور اسی مقصد کو سامنے رکھ کر انہوں نے یہ کہانیاں لکھی ہیں۔ ہر ایک کہانی میں

کسی نہ کسی مذہبی اصول یا اخلاقی نکتے پر روشنی ڈالی ہے ــــ لیکن اس خوبی سے کہ کہانی کی دلچسپی کہیں بھی کم نہیں ہونے پائی بعض کہانیاں تو انتہائی بلند ہیں۔

ہر متمدن قوم ٹالسٹائی کے شاہکاروں کی پرستار ہے اور آج جبکہ ہندوستان ترقی پسند ادب کی وسیع شاہراہ پر گامزن ہے ہندوستان کے نوجوان ٹالسٹائی کے شاہکاروں کو ہندوستانی ادب کی زبان سے سنکر یقیناً بہت متاثر ہونگے ــــ اور حضرت یزدانی جالندھری کے ممنون بھی کہ وہی اس کا ذریعہ ہیں۔

جناب یزدانی ایک سلجھے ہوئے ادیب ہیں اور انہوں نے آجکل کے نام نہاد ترقی پسند وں کی راہ چھوڑکر تخیل کی عریانی اور حد سے متجاوز رنگینی سے گریز کیا ہے۔ انہوں نے اپنے لئے ایک پاکیزہ معیار کا انتخاب کیا ہے۔ جسکی پہلی کڑی ٹالسٹائی کے دو طویل افسانوں کا مجموعہ "گناہ عزیمت" تھا اور زیر نظر کتاب اس کی دوسری کڑی!

یہ امر بھی باعث مسرت ہے کہ ٹالسٹائی نے اپنے فن پر دشوار پسندی کا دھبہ نہیں لگنے دیا اور فاضل مترجم نے بھی زبان کی پاکیزگی اور سلاست کا خاص خیال رکھا ہے ترجمہ کی وادی یقیناً پُرخار ہے مصنف کے نظریہ کی صحیح ترجمانی اور حقیقت کی راہ پر کامیابی سے گامزنی کافی دشوار ہے گویا ع۔ صد منزل است و منزلِ اوّل قیامت است

لیکن جناب یزدانی نے کردار اور ماحول بدلنے کے باوجود مصنف کے احساسات کو ٹھیس دینے نہیں دیا، اور یہی ایک خوبی اس کتاب کی لاثانی حیثیت کا اعتراف کرانے کے لئے کافی ہے ــــ قدرشناسی ناظرین کا کام ــــ

ع :۔ پھول کچھ ہم نے چنے ہیں اُن کے دامن کے لئے

فنہر جلال آبادی

اِنتساب

ابوظفر سیّد عبدالحفیظ عرفانی شاہ

و

ابونصر سیّد عبدالرحمٰن رضوانی شاہ

کیلئے

تحفۂ محبّت!

یزدانی جالندھری

٩

شیطان کی موت

ایک گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا جس کے تین بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا جسونت سپاہی تھا، منجھلا دھن راج تجارت میں ماہر اور تیسرا بلدیو نیم دیوانہ سا تھا۔ شیلا نامی ایک گونگی لڑکی بھی تھی۔ جسونت تو جاکر کسی راجہ کی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ دھن راج نے کسی بڑے شہر میں جاکر دوکان کھول لی، اور تجارت کرنے لگا۔ بے وقوف بلدیو اور شیلا ماں باپ کے پاس رہ کر کھیتی باڑی کرنے لگے۔

جسونت نے فوج میں اعلیٰ عہدہ حاصل کر کے ایک علاقہ خرید لیا
اور کسی جاگیر دار کی لڑکی سے شادی کر لی اس کی آمدنی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔
پھر بھی جو کچھ آتا خرچ ہو جاتا، کچھ بھی پس انداز نہ ہوتا۔

ایک دن اس نے اپنے علاقہ میں جا کر کسانوں سے بٹائی کا مطالبہ کیا
کسانوں نے کہا "مہاراج ہمارے پاس بیل ہیں نہ ہل اور نہ بیج۔ بٹائی
کہاں سے دیں۔ پہلے یہ سامان لا دیجئے۔"

یہ سنکر جسونت باپ کے پاس پہنچا۔ اور کہا "اتنا روپیہ پیسہ ہوتے
ہوئے بھی آپ نے میری کچھ مدد نہیں کی۔ میں نے فوج میں نہایت
بہادری سے کام کر کے اور راجہ کو خوش کر کے ایک علاقہ خریدا ہے۔ اُس
کے انتظام کے لئے روپے کی ضرورت ہے۔ میں آبائی جائداد میں تیسرے
حصّے کا حقدار ہوں۔ اس لئے آپ میرا حصّہ مجھے دے دیجئے۔ تاکہ میں
اپنا علاقہ ٹھیک کر سکوں۔"

باپ نے کہا "بھلا تم نے ملازمت کے دوران میں کبھی گھر میں کچھ بھیجا
ہے؟ سب کام بلدیو کرتا ہے میرے خیال میں تمہیں تیسرا حصّہ دینا بلدیو
اور شیلا سے ناانصافی کرنا ہے۔"

"بلدیو تو پاگل ہے" جسونت نے کہا "اور شیلا گونگی اور بہری ہے۔
انہیں دولت کی کیا ضرورت؟ وہ روپے سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟"
"اچھا بلدیو سے دریافت کر لوں!"

باپ کے دریافت کرنے پر بلدیو نے نہایت مسرّت سے جسونت کو

تیسرا حصہ دینے پر آمادگی کا اظہار کیا — اور جسونت تیسرا حصہ لے کر چلا گیا۔

دھن راج نے بھی تجارت میں کافی دولت کمائی اور ایک دولتمند شخص کی لڑکی سے شادی کر لی۔ لیکن روپے کی خواہش ایسی ہے کہ انسان کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ بھی باپ کے پاس پہنچا اور تیسرا حصہ مانگا

باپ نے غصے سے کہا "میں تمہیں ایک کوڑی بھی نہیں دے سکتا۔ ذرا خیال تو کرو۔ تم نے تجارت میں ہزاروں لاکھوں کمائے۔ کبھی ماں باپ کو بھی پوچھا؟ یہاں جو کچھ ہے سب بلدیو کی محنت ہے۔ اس کا پیٹ کاٹ کر تمہیں کیونکر دے سکتا ہوں؟"

دھن راج نے کہا "بے وقوف بلدیو کو روپے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا آپ کے خیال میں بلدیو اپنے دیوالے سے کوئی شخص اپنی لڑکی کی شادی کریگا ہرگز نہیں۔ رہی شیلا تو وہ گونگی اور بہری ہے۔ میں بلدیو سے پوچھ لیتا ہوں کہ اس کی کیا رائے ہے"

دھن راج کے دریافت کرنے پر بلدیو اسے بھی تیسرا حصہ دینے پر رضامند ہو گیا اور وہ اپنا حصہ لے کر چلتا بنا۔ بلدیو کے پاس جو سامان رہا، وہ اسی سے کھیتی باڑی کا کام کر کے ماں باپ اور بہن کا پیٹ پالنے لگا۔



یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر شیطان کو بڑا صدمہ پہنچا — کہ بھائیوں

نے نہایت آسانی اور محبّت سے دولت کی تقسیم کرلی ۔ کوئی جھگڑا نہ ہوا ۔ جوتی پیزار تک نوبت نہ پہنچی ۔ اس نے تینوں بھوتوں کو بلا کر کہا "دیکھو، جسونت، دھن راج اور بلدیو تینوں بھائی ہیں ۔ دولت، جائداد کی تقسیم کے وقت انہیں لڑنا چاہیئے تھا ۔ لیکن بے وقوف بلدیو نے سب کام بگاڑ دیا ۔ اسی کی حماقت سے تینوں بھائی عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ تم جاؤ اور ایک ایک کے پیچھے پڑ کر ایسا طوفان بپا کرو کہ تینوں آپس میں لڑ مریں ۔ دیکھنا بڑی ہوشیاری سے کام کرنا ۔"

تینوں بھوتوں نے یک زباں ہو کر کہا "دھرم اوتار! تینوں کو آپس میں لڑا لڑا کر مار نہ ڈالا ۔ تو ہم آپ کے شاگرد ہی نہیں ۔"

"شاباش! شاباش!" شیطان نے اچھل کر کہا "جاؤ لیکن یہ یاد رکھو جو بھی ناکام واپس آیا ۔ اس کی کھال کھینچ لونگا ۔"

تینوں بھوت وہاں سے رخصت ہو کر ایک جھیل کے کنارے پہنچے اور وہاں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا کہ کون کس کی طرف جائے ۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ جس بھوت کا کام پہلے ختم ہو جائے، وہ فوراً دوسرے بھوت کی مدد کرے ۔

چند روز بعد وہ پھر اسی جھیل کے کنارے جمع ہوئے اور اپنی اپنی داستان سُنانے لگے ۔

پہلے نے کہا "بھائی صاحب! میرا کام تو بن گیا جسونت اب بھاگ کر باپ کی پناہ میں آنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا ۔"

"سناؤ تو کیسے پھانسا تم نے اس کو؟" دوسرے نے پوچھا۔

"میں نے جسونت کو اتنا مغرور ومتکبر بنا دیا کہ ایک دن اس نے راجہ سے کہا ۔ مہاراج! اگر آپ مجھے سپہ سالار بنا دیں تو میں آپ کو تمام دنیا کا حکمران بنا دوں۔ راجہ نے اُسے فوراً سپہ سالار بنا کر حکم دیا، کہ لنکا کو فتح کرو۔ بس پھر کیا تھا، لگی جنگ کی تیاری ہونے۔ لڑائی چھڑنے سے ایک رات پیشتر میں نے جسونت کی تمام بارُود نم آلود کر دی۔ اُدھر لنکا کے راجہ کے لیئے گھاس کے لاتعداد سپاہی بنا دیئے۔ دونوں فوجوں کے آمنے سامنے ہونے پر جسونت کے سپاہیوں نے دشمن کی فوج عظیم کو دیکھا تو اُن کے چھکے چھوٹ گئے جسونت نے گولے پھینکنے کا حکم دیا۔ بارود گیلی ہو چکی تھی۔ توپیں آگ کہاں سے اُگلتیں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ جسونت کی فوج کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ راجہ نے غضب ناک ہو کر اسے سخت بُرا بھلا کہا۔ اُسے موقوف کر دیا اور اس کا علاقہ ضبط کر لیا۔ اس وقت وہ جیل خانہ میں قید ہے۔ صرف یہ کام باقی رہ گیا ہے کہ اُسے قید سے چھڑا کر باپ کے پاس پہنچا دوں۔ پھر چھٹی۔ آپ میں سے جسے ضرورت ہو اس کی امداد کے لئے تیار رہوں"

دوسرے نے کہا "میرا کام بھی باحسن سرانجام ہو گیا ہے۔ تمہاری امداد کی ضرورت نہیں۔ میں نے دھن راج کو پہلے تو خوب موٹا کر کے کاہل بنا دیا۔ پھر اسے اتنا لالچی بنا دیا کہ وہ دنیا بھر کا مال خرید خرید کر ذخیرہ

کرنے لگا۔ ابھی تک خرید کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کی تمام دولت ختم ہو چکی ہے اور اب روپیہ قرض لے کر مال خرید رہا ہے۔ ایک ہفتے میں اس کا تمام مال تباہ کر دوں گا اور پھر اُسے باپ کی پناہ میں آنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے گا۔"

تیسرا بولا" بھائی ہمارا حال تو بہت بُرا ہے۔ پہلے مَیں نے بلدیو کے پینے کے پانی میں درد شکم پیدا کرنے والی بوٹی ملا دی۔ پھر کھیت میں جا کر زمین کو فولاد کی طرح سخت کر دیا کہ اس پر ہل نہ چل سکے۔ میں سمجھتا تھا کہ پیٹ کے درد کی وجہ سے وہ ہل چلانے کے لئے نہ آئے گا۔ لیکن وہ تو بالکل پاگل ہے ـــــ پاگل! آ کر ہل چلانے لگا۔ ہائے ہائے کرتا جاتا تھا لیکن ہل کو ہاتھ سے نہ چھوڑتا تھا۔ مَیں نے ہل توڑ دیا۔ وہ گھر جا کر دوسرا ہل لے آیا۔ میں نے زمین میں گھس کر ہل کو پکڑ لیا ـــــ اُس نے اس زور سے ہل کو دھکیلا کہ میرے ہاتھ کٹتے کٹتے بچ گئے۔ اس نے صرف ایک ٹکڑے کے سوا تمام کھیت میں ہل چلا دیا ہے۔ اگر تم میری مدد نہ کرو گے تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ کیونکہ اگر وہ اسی طرح کھیتوں میں ہل چلاتا رہا تو اُس کے بھائی بھوکوں نہیں مر سکتے ـــــ پھر لڑائی جھگڑا کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ نہایت آرام سے انہیں بھی کھلاتا پلاتا رہے گا۔"

پہلا بھوت بولا" کیا ہوا، کچھ فکر نہیں۔ دیکھا جائے گا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ میں کل ضرور تمہارے پاس آؤں گا۔"



(۳)

بلدیو ہل چلا رہا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں ایک جھاڑی میں اُلجھ گیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ کھیت میں تو کوئی جھاڑی نہ تھی، یہ کہاں سے آگئی۔ بات یہ تھی کہ بھوت نے جھاڑی بن کر اس کی ٹانگ پکڑ لی تھی۔

بلدیو نے ہاتھ بڑھا کر جھاڑی اکھاڑ ڈالی۔ دیکھا تو اس میں کالا کلوٹا بھوت بیٹھا تھا۔

بلدیو نے اس کا گلا دباتے ہوئے کہا: "بولو دبادوں گلا؟"

بھوت عاجزی سے بولا: "مجھے چھوڑ دو، جو کچھ تم کہو گے، وہی کروں گا۔"

"اچھا بتاؤ۔ تم کیا کر سکتے ہو؟"

"سب کچھ۔"

"میرے پیٹ میں سخت درد ہو رہا ہے، اسے ٹھیک کر دو۔"

"بہت اچھا۔" کہہ کر بھوت نے زمین میں سے تین بوٹیاں لا کر ایک بوٹی بلدیو کو کھلادی، درد فوراً رفع ہو گیا۔ دوسری دو بوٹیاں بلدیو کو دے کر وہ بولا "جسے ایک بوٹی کھلاؤ گے۔ اس کی سب بیماریاں فوراً رفع ہو جائیں گی۔ اب مجھے جانے دو۔ پھر کبھی نہ آؤں گا۔"

"ہاں جاؤ۔ خدا تمہیں برکت دے گا۔"

خدا کا نام سنتے ہی بھوت تحت الثریٰ میں چلا گیا اور زمین میں صرف ایک سوراخ رہ گیا۔

بلدیو نے دوسری دو روٹیاں پگڑی میں باندھ لیں اور گھر چلا آیا۔ دیکھا کہ بھائی جسونت اور اس کی بیوی آئی ہوئی ہے۔ وہ بڑا خوش ہوا۔
جسونت بولا۔" بھائی بلدیو! جب تک مجھے کوئی ملازمت نہ ملے، تم ہم دونوں کو یہاں رکھ سکتے ہو؟"
"کیوں نہیں؟" بلدیو نے کہا۔" تمہارا اپنا گھر ہے۔ بڑی خوشی سے رہو۔"
کھانا کھاتے وقت جسونت کی صفائی پسند بیوی شوہر سے بولی۔ "مجھے بلدیو کے بدن سے بدبو آتی ہے۔ اسے باہر بھیج دو۔"
جسونت نے بھائی سے کہا۔" بلدیو! میری بیوی کہتی ہے کہ تمہارے بدن سے بدبو آتی ہے۔ پاس بیٹھا نہیں جاتا۔ تم باہر بیٹھ کر کھانا کھا لو۔"
"ہاں۔ ہاں! میں باہر چلا جاتا ہوں۔ تمہیں کیوں تکلیف ہو۔"



دوسرے دن جسونت والا بھوت کھیت میں آ کر بلدیو کے بھوت کو تلاش کرنے لگا۔ اس کا کہیں پتہ نشان نہ ملا۔ کھیت کے کونے پر اسے ایک سوراخ دکھائی دیا۔
بھوت سمجھ گیا کہ ایک ساتھی کام آیا۔ خیر کچھ پروا نہیں۔ اس نے چارے کے کھیت میں پہنچ کر اتنا پانی چھوڑ دیا کہ تمام گھاس پانی میں ڈوب گئی۔
اتنے میں بلدیو وہاں آ کر گھاس کاٹنے لگا۔ درانتی کا منہ مڑ گیا۔

لیکن گھاس نہ کٹ سکی۔ بلدیو نے سوچا کہ پہلے درانتی تیز کرنی چاہئے
رہا کام، یہ میرا فرض ہے، خواہ ایک ہفتہ ہی کیوں نہ لگ جائے۔
لیکن گھاس کاٹے بغیر یہاں سے چلا جاؤں تو میرا نام بلدیو نہیں۔
گھر جاکر وہ درانتی تیز کر لایا۔ بھوت نے درانتی کو پکڑنے
کی کوشش کی۔ لیکن پکڑ نہ سکا —— کیونکہ بلدیو تیزی سے
درانتی چلا رہا تھا۔ جب کھیت کا صرف تھوڑا سا حصہ رہ گیا
تو بھوت بھاگ کر اس میں جا چھپا۔

بلدیو کب رکنے والا تھا۔ وہ گھاس کاٹتا وہاں تک پہنچ
گیا۔ بھوت وہاں سے بھاگنے لگا۔ لیکن اس کی دُم کٹ گئی۔

بھوت نے سوچا۔ چلو یہاں سے کھیتوں میں چلیں دیکھیں
جَو کیسے کاٹتا ہے۔ وہاں جاکر دیکھا تو جَو کاٹے پڑے تھے۔

بھوت نے دل میں کہا کہ یہ بیوقوف بڑا سخت ہے۔
دن نہیں نکلنے دیا اور رات رات میں جَو کا کھیت کاٹ کے
رکھ دیا۔ اچھا! اب کھلیان میں چل کر اس کا بھوسہ خراب
کرتا ہوں۔

بھوت بھاگ کر "جری" کے کھلیان میں جا چھپا۔ بلدیو
بیل گاڑی لے کر جری لادنے کھلیان میں پہنچا اور ایک ایک
گٹھا اٹھا کر گاڑی میں رکھنے لگا۔ اتنے میں اس کا ہاتھ بھوت
والے گٹھے پر جا پڑا۔ اس نے ڈانٹ کر کہا: "کمبخت! تو پھر

آ گیا ؟"

بھوت نے کہا "میں اور ہوں۔ پہلا میرا بھائی تھا"
"خیر کوئی بھی ہو۔ اب زندہ نہ جانے پاؤ گے"
"اگر آپ مجھے چھوڑ دیں، تو جو حکم دیں گے وہ بجا لاؤں گا"
بھوت نے گڑگڑا کر کہا۔
"اچھا تو تم کیا کر سکتے ہو۔ ؟"
"میں بھوسے کے سپاہی بنا سکتا ہوں"
"سپاہی کیا کام دیتے ہیں ؟"
"تم اُن سے جو کام چاہو لے سکتے ہو"
"وہ گانا گا سکتے ہیں ؟"
"واہ کیوں نہیں !"
"اچھا تو بناؤ"
"تم چری کے گٹھے لے کر اُن پر یہ منتر پڑھو ـــــــ اے گٹھے !
میرے حکم سے سپاہی بن جا اور پھر اُسے زمین پر دے مارو
سپاہی بن جائے گا"
بلدیو نے ایسے ہی کیا۔ چری کے گٹھے سپاہی بننے لگے، یہاں
تک کہ پوری پلٹن تیار ہو گئی اور رزمیہ باجہ بجنے لگا۔
بلدیو نے ہنس کر کہا:۔ "واہ بھئی واہ، یہ تو خوب تماشا ہے
اسے دیکھ کر بچے بہت خوش ہوں گے"

"اچھا تو اب مجھے اجازت ہے؟" بھوت نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی نہیں، مجھے پھر سپاہی سے گٹھے بنانے کا منتر بھی سکھا دو، ورنہ یہ تو ہمارا تمام اناج چٹ کر جائیں گے۔"

"جب انہیں پھر گٹھے بنانا ہو، تو کہو ——— اے سپاہی، اے میرے غلام، میرے حکم سے پھر گٹھا بن جا۔ بس سب گٹھے بن جائیں گے۔"

بلدیو نے پھر سب سپاہیوں سے چری کے گٹھے بنا لئے۔

"اچھا اب جاؤں؟" بھوت نے پوچھا۔

"ہاں، جاؤ۔ خدا تم پر رحم کرے۔"

خدا کا نام سنتے ہی بھوت زمین میں سما گیا اور وہاں صرف ایک سوراخ رہ گیا۔

بلدیو جب گھر واپس آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ منجھلا بھائی اپنی بیوی سمیت آیا ہوا ہے۔ اس نے بلدیو سے کہا "چھوٹے بھیا! قرضخواہوں کے خوف سے بھاگ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ جب تک روزگار کا کوئی انتظام نہ ہو، ہم یہاں ٹھہر سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ ہاں ضرور! بھلا یہ گھر کس کا ہے اور میں کس کا ہوں؟"

کھانے کے وقت دھن راج کی بیوی نے کہا: "میں تو اس گنوار کے پاس بیٹھ کر نہیں کھا سکتی۔"

دھن راج نے بلدیو سے کہا :- "بھائی بلدیو ! میری عورت
چاہتی ہے کہ تم باہر جا کر کھانا کھا لو"
بلدیو بڑی خوشی سے باہر چلا آیا ۔



دوسرے دن جسونت والا بھوت، بلدیو کو ستانے اور ساتھیوں
کی امداد کے لئے وہاں پہنچا - دیر تک وہ ساتھیوں کو ڈھونڈتا رہا ---
لیکن کسی کا نام ونشان تک نہ ملا - آخر تلاش کرتے کرتے ایک سوراخ
کھیت کے ایک کونے میں اور ایک کھلیان میں ملا - اسے معلوم ہو
گیا - کہ دونوں بھوت کام آئے - اب مجھے ہی اس احمق کا مقابلہ
کرنا ہو گا -

وہ بلدیو کی تلاش میں ادھر اُدھر گھومنے لگا - بلدیو مکان بنانے
کے لئے جنگل میں درخت کاٹ رہا تھا - کیونکہ دونوں بھائیوں کے
خاندان سمیت آنے سے جگہ کم ہو گئی تھی - بھائی یہ چاہتے تھے کہ الگ
الگ مکان میں رہیں --- اس لئے دو نئے مکان بنانا ضروری تھا

بھوت درخت پر چڑھ گیا اور شاخوں میں چھپ کر کام میں
رکاوٹ ڈالنے لگا - لیکن بلدیو کب باز آنے والا تھا - شام ہوتے
ہوتے اس نے کئی درخت کاٹ ڈالے - آخر اس درخت پر بھی ہاتھ
صاف کر ڈالا - جس پر بھوت چھپا بیٹھا تھا - ٹہنیاں کاٹتے وقت بھوت
اس کے ہاتھ آ گیا ! -

"ارے تم پھر آگئے ؟" بلدیو نے غصہ سے کہا۔

"نہیں نہیں، میں تیسرا ہوں۔ پہلے دونوں میرے بھائی تھے۔"

"خیر، کچھ بھی ہو۔ اب تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔"

"تم جو کچھ کہو گے، وہی کروں گا۔ مہربانی کر کے مجھے جان سے نہ مارو!"

"تو تم کیا کر سکتے ہو ؟"

"میں درخت کے پتوں سے سونا بنا سکتا ہوں۔"

"اچھا بناؤ۔"

"بھوت نے درخت کے خشک پتے لے کر ہاتھوں میں لئے اور ان پر کوئی منتر پڑھ کر سونا بنا دیا۔ بلدیو سونا دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور اس نے منتر سیکھ لیا۔ پھر بولا "بھئی اس کا رنگ تو بڑا دلکش ہے، بچوں کے کھلونے خوب بنیں گے۔"

"اچھا تو اب جانے کی اجازت ہے ؟" بھوت نے پوچھا۔

"جاؤ، خدا تم پر برکت نازل کرے۔"

خدا کا نام سنتے ہی وہ بھوت بھی زمین میں سما گیا ۔۔۔ اور وہاں صرف ایک سوراخ رہ گیا۔

(۲)

گھر بنا کر تینوں بھائی آرام و سکون سے علیحدہ علیحدہ رہنے

لگے جنم اشٹمی کے تہوار پر بلدیو نے بھائیوں کو کھانے کی دعوت دی گاؤں کے سب باشندے اس دعوت میں مدعو تھے۔ بھائیوں نے جواب دیا کہ ہم گنواروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتے۔

بلدیو نے کچھ بُرا نہ مانا۔ گاؤں بھر کے بوڑھوں، بچوں، مردوں اور عورتوں نے مل کر بلدیو کے ہاں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد بلدیو نے کہا۔ "کیوں بھائیو! تمہیں ایک تماشا دکھاؤں؟"

سب طرف سے "ضرور ضرور!" کی آوازیں آئیں۔

بلدیو نے خشک پتے لے کر ان پر منتر پڑھا اور سونے کے ٹکڑوں سے ٹوکرا بھر دیا۔ پھر وہ انہیں لوگوں کی طرف پھینکنے لگا۔ کسان سونے کے ٹکڑے لوٹنے لگے۔ اتنی ریل پیل ہوئی کہ ایک بیچاری بڑھیا کچلی گئی۔

بلدیو نے سب کو ڈانٹا کہ تم نے بڑھیا بیچاری کو کیوں کچل دیا۔ آرام سے بیٹھے رہو تو سب کو سونا مل جائے۔ سونا تقسیم کرنے کے بعد اس نے گاؤں کی عورتوں سے گانے کی فرمائش کی۔ سب مل کر گانے لگیں۔

بلدیو نے کہا "تمہیں تو گانا بھی نہیں آتا۔"

انہوں نے کہا "ہمیں تو ایسا ہی آتا ہے۔ تم کہیں سے گویّوں کو بلا لو۔"

بلدیو نے فوراً بھوسے کے سپاہی بنا کر پلٹن کھڑی کر دی اور فوجی باجہ بجنے لگا۔ گنوار لوگ حیرت زدہ ہو کر سننے لگے۔ سپاہی بڑی دیر تک باجہ

بجاتے اور رزمیہ گیت گاتے رہے - پھر بلدیو نے ان سب کو بھوسہ بنا دیا اور جنم اشٹمی کا تہوار ختم ہؤا ؂

(۶)

جب جسونت نے یہ داستان سنی تو وہ ہانپتا ہوا بھائی کے پاس آیا - اور کہا :- "بلدیو بھیا! یہ سپاہی تم نے کیسے بنائے تھے ؟"

"کیوں آپ کو کیا کام ہے ؟" بلدیو نے پوچھا -

" کام کی ایک ہی کہی - سپاہیوں کی مدد سے ہم ریاست کو فتح کر سکتے ہیں "

"یہ بات ہے - تم نے پہلے کیوں نہیں کہا ؟ کھلیان میں چلئے - جتنے سپاہی درکار ہوں ، بنا دوں - لیکن شرط یہ ہے کہ انہیں فوراً یہاں سے لے جانا ، ورنہ وہ گاؤں کا گاؤں چٹ کر جائیں گے "

چنانچہ کھلیان میں جا کر اس نے بھائی کو کئی پلٹنیں تیار کر دیں ، اور پوچھا :- "بس ؟"

بھائی نے خوش ہو کر کہا :- "بس کافی ہے - میں تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا "

"اس میں احسان کی کونسی بات ہے " بلدیو نے کہا " اب کے برس بھوسہ کافی ہوا ہے - اگر کبھی ضرورت پڑے ، تو پھر آ جانا جتنے سپاہی کہوگے اور بنا دوں گا "

اب جسونت کے پاؤں فخر و مسرت سے زمین پر نہ پڑتے تھے -

فوراً راجہ سے لڑنے کے لئے روانہ ہوگیا۔

جسونت کے جاتے ہی دھن راج آپہنچا اور کہا "بھائی جان! میں نے سنا ہے کہ تم سونا بنا لیتے ہو۔ آہ! اگر تھوڑا سا مجھے بھی بنا دو تو تمام دنیا کی دولت کما لوں"۔

"اچھا! سونے میں اتنی طاقت ہے!! تم نے پہلے کیوں نہیں کہا؟ کتنا سونا چاہئے؟"

"بس تین ٹوکرے سونا بنا دو۔"

بلدیو نے تین ٹوکرے سونا بنا دیا۔

دھن راج نے کھل کر کہا: "تم نے بڑی عنایت کی"۔

"عنایت کی کیا بات ہے۔ جنگل میں پتے بہت ہیں۔ اگر پھر کبھی ضرورت پڑے تو جتنا سونا کہو گے بن جائے گا"۔

دھن راج بھی بیوی کے ہمراہ تجارت کرنے چل دیا۔



جسونت نے فوج کی مدد سے ایک بڑی ریاست فتح کر لی۔ اُدھر دھن راج نے تجارت سے دولت کے انبار لگا لیئے۔ ایک دن بھائیوں میں ملاقات ہوگئی اور گفتگو شروع ہوئی۔

جسونت نے کہا: "دھن بھیا! میں نے تو اپنی الگ حکومت قائم کر لی ہے اور آرام سے زندگی بسر کرتا ہوں۔ لیکن ان سپاہیوں کا پیٹ کہاں سے بھروں؟ روپے کی بڑی قلت ہے۔ ہمیشہ یہی فکر لگی رہتی ہے"۔

دھن راج نے کہا " تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے فکر نہیں ؟ میری دولت کا شمار نہیں لیکن اس کی حفاظت کے لئے سپاہی نہیں ملتے۔ بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں۔"

" چلو بلدیو کے پاس چلیں۔ میں تمہارے لئے تھوڑے سے سپاہی بنوا دوں اور تم میرے لئے تھوڑا سا سونا بنوا دو!"

یہ مشورہ کر کے دونوں بھائی بلدیو کے پاس آئے۔

جسونت نے کہا۔ " بلدیو بھائی! میری فوج میں کچھ کمی ہے۔ کچھ سپاہی اور بنا دو!"

" نہیں، اب میں اور سپاہی نہیں بنا سکتا۔"

" لیکن تم نے تو وعدہ کیا تھا ـــــ ورنہ میں آتا ہی کیوں ؟ لیکن بات کیا ہے۔ بناتے کیوں نہیں ؟"

" تمہارے سپاہیوں نے ایک انسان کو مار ڈالا۔ کل جب میں کھیت جوت رہا تھا، تو وہاں سے ایک ارتھی گزری۔ میرے دریافت کرنے پر ایک عورت نے کہا ـــ جسونت کے سپاہیوں نے لڑائی میں میرے شوہر کو مار ڈالا۔ لیکن میں تو آج تک صرف یہ سمجھتا تھا کہ سپاہی باجہ بجایا کرتے ہیں۔ مگر وہ تو انسانوں کو جان سے مار دیتے ہیں۔ ایسے سپاہی بنانے سے تو دنیا تباہ ہو جائیگی۔"

دھن راج نے آگے بڑھ کر کہا۔ " اچھا، اگر سپاہی نہیں بناتے تو میرے لئے تھوڑا سا سونا ہی بنا دو۔ تم نے اقرار کیا تھا کہ ضرورت پڑی، تو پھر بنا دوں گا۔"

"ہاں اقرار تو کیا تھا، لیکن اب میں سونا بھی نہیں بناؤں گا۔"
"کیوں؟"
"تمہارے سونے نے بسنت کی لڑکی سے اس کی گائے چھین لی۔"
"وہ کیسے؟"
"بسنت کی لڑکی کے پاس ایک گائے تھی۔ بچے اس کا دودھ پیتے تھے۔ کل وہ بچے میرے پاس دودھ مانگنے آئے۔ میں نے پوچھا کہ تمہاری گائے کہاں گئی تو کہنے لگے ـــ دھن راج کا ایک ملازم آکر تین ٹکڑے سونے کے عوض ہماری گائے لے گیا۔ میں تو یہ جانتا تھا کہ سونا بنوا کر تم بچوں کو بہلایا کرو گے۔ لیکن تم نے تو ان کی گائے ہی چھین لی بس سونا اب نہیں بن سکتا۔"

دونوں بھائی مایوس ہو کر واپس لوٹے۔ راستے میں سمجھوتا ہوا کہ جسونت دھن راج کو کچھ سپاہی دے اور وہ معاوضے میں جسونت کو کچھ سونا۔ کچھ دن بعد دھن راج نے بھی دولت کے بل پر بہت بڑا علاقہ خرید لیا۔ اب دونوں بھائی اپنی اپنی ریاست میں حکومت کرنے لگے۔

(۸)

بلدیو اپنی گونگی بہن کی مدد سے کھیتی باڑی کا کام کر کے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرتا رہا۔ ایک دن اس کی گنیا بیمار ہو گئی۔ اس نے فوراً پہلے بھوت کی دی ہوئی بوٹی اسے کھلا دی۔ وہ تندرست ہو کر اچھلنے کودنے لگی۔ ماں باپ نے بلدیو سے حقیقتِ حال پوچھی تو اس نے بوٹی ملنے کا تمام ماجرا کہہ سنایا۔
اتفاق سے انہی دنوں وہاں کے راجہ کی لڑکی بیمار ہو گئی۔ راجہ نے منادی

کرادی کہ جو آدمی میری لڑکی کو تندرست کردے گا۔ اسی کے ساتھ اس کی شادی کردو نگا۔ اں باپ نے بلدیو سے کہا کہ یہ بڑا اچھا موقعہ ہے۔ تمہارے پاس ایک بوٹی باقی ہے۔ جاکر راجہ کی بیٹی کا علاج کرو، اور پھر عمر بھر عیش و آرام سے بسر کرو۔

بلدیو رضامند ہو کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ دروازے پر ایک کنگال بڑھیا کھڑی ہے۔ اس نے بلدیو سے کہا۔ "بیٹا! میں نے سنا ہے کہ تم بیمار کو تندرست کر دیتے ہو۔ میں بہت دنوں سے سخت تکلیف میں ہوں۔ پیٹ بھر روٹی بھی بڑی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ دوا کہاں سے لاؤں۔ تم کوئی دوا دے دو تو عمر بھر دعائیں دیتی رہوں گی۔"

بلدیو تو رحم و ہمدردی کی مورتی تھا۔ فوراً بوٹی نکال کر بڑھیا کو کھلادی اور وہ تندرست ہو کر دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

ماں باپ یہ حال سن کر بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے۔ "بلدیو! تم بڑے کم عقل ہو۔ کہاں راجکماری اور کہاں یہ بڑھیا۔ بھلا اس بڑھیا کو بوٹی کھلانے سے کیا ملا؟"

بلدیو نے کہا۔ "راجکماری کے علاج کی مجھے فکر ہے۔ وہاں بھی جاتا ہوں۔"

"بوٹی تو ہے نہیں، جاکر کیا کروگے؟" ماں نے کہا۔

"کچھ فکر نہیں، دیکھو تو ہوتا کیا ہے؟"

رحمدل شخص کے دم قدم میں بھی برکت ہوتی ہے۔ جب بلدیو راج محل کے دروازے پر پہنچا۔ تو راج کماری تندرست ہو گئی۔ راجہ نے انتہائی مسرت

ہو کر بلدیو سے اس کی شادی کر دی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد راجہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی راجکماری ہی اس کے تخت و تاج کی وارث تھی۔ چنانچہ اس کی جگہ اب بلدیو راجہ بن گیا۔

اب تینوں بھائی حکمران تھے۔

(۹)

جسونت کی شہرت دور نزدیک پھیل گئی۔ اس کا جاہ و جلال خورشید جہانتاب کی طرح ضیا افروز عالم بن گیا۔ اس نے بھوسے کے سپاہیوں سے سچ مچ کے سپاہی بنا لئے۔ ملک بھر میں حکم جاری کر دیا کہ ہر دس گھروں میں سے ایک آدمی فوج میں بھرتی کیا جائے۔ ان رنگروٹوں کو بھوسے کے سپاہیوں کی نگرانی میں فوجی تربیت دلا کر اس نے عظیم الشان فوجی طاقت بہم پہنچالی۔ جب بھی کوئی دشمن اس کے علاقہ پر حملہ کرتا۔ اسے منہ کی کھانا پڑتی۔ تمام ہمسایہ ملک اس کے نام سے کانپنے لگے۔

دھن راج بڑا عقلمند تھا۔ اس نے خزانہ بھرنے کے لئے انسانوں، گھوڑوں، گاڑیوں، جوتوں، جرابوں، کپڑوں ـــــ غرضیکہ ہر چیز پر محصول لگا دیا۔ چوری چکاری، لوٹ مار، اور دولت جائداد کے جھگڑوں کے سلسلے میں قوانین بنائے۔ دنیا میں روپیہ ہی سب کچھ ہے۔ روپے کی کشش سے سب لوگ آکر اس کی غلامی کا دم بھرنے لگے۔

اب بلدیو کی کرتوت سنئے ـــــ سسر کا کریا کرم کر کے اس نے شاہی

لباس تو اتار کر صندوق میں رکھ دیا۔ موٹے کھدر کے کپڑے پہن لئے اور کسانوں کی طرح کھیتی باڑی کا کام کرنے کی تجویزیں سوچنے لگا۔ خالی بیٹھے بیٹھے اس کا جی اکتا گیا تھا۔

کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ جسم میں چربی بڑھنے لگی تھی۔ بھوک اور نیند جاتی رہی تھی۔ اس نے اپنی گونگی بہن شیلا اور ماں باپ کو وہیں بلا لیا او حسب معمول کھیتی باڑی کا کام کرنے لگا۔

ایک وزیر نے کہا۔ "آپ تو راجہ ہیں آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

" تو کیا میں بھوکا مر جاؤں؟" بلدیو نے حیرت زدہ ہو کر کہا "مجھے تو کام کئے بغیر کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا۔ بھوک ہی نہیں لگتی۔ کہو تو کیا کروں؟"

دوسرا وزیر بولا۔ "مہاراج! حکومت کا کام کیونکر چلے گا؟ ملازموں کو تنخواہ کیونکر دی جائے؟ خزانے میں تو ایک روپیہ تک نہیں۔"

" اگر روپیہ نہیں تو تنخواہ نہ دو۔" بلدیو نے کہا۔

" تنخواہ کے بغیر کام کون کریگا؟"

" کام کیسا؟ ــ نہ کریں۔ کرنے کو کھیتوں میں تھوڑا کام ہے؟ کھاد سنبھالنا وقت پر بیج بونا ــ یہ سب کام ہی تو ہے اور کیا ہے؟"

اتنے میں وزیر نے ایک مقدمہ کے کاغذات پیش کئے اور مدعی و مدعا علیہ پیش ہوئے۔

مدعی بولا " مہاراج! اس نے میرے روپے چرا لئے ہیں۔"

" خیر ــ کوئی بات نہیں۔" راجہ نے کہا۔ "اسے روپے کی ضرورت ہوگی"

سب لوگ سمجھ گئے کہ راجہ بیوقوف ہے۔

ایک دن رانی نے کہا "پرانیشور! سب لوگ کہتے ہیں کہ آپ بے وقوف ہیں"

"تو اس میں ہرج ہی کیا ہے؟" بلدیو نے کہا۔

رانی نے سوچا کہ دھرم کا حکم ہے کہ عورت کا خدا اس کا شوہر ہوتا ہے جس کام سے شوہر خوش ہو عورت کو وہی کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ بھی راجہ کے ساتھ کھیتی باڑی کا کام کرنے لگی۔

مثل مشہور ہے "جیسا راجہ ویسی پرجا" یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر سب عقلمند لوگ تو دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔ بلدیو کی سلطنت میں صرف اس جیسے بیوقوف ہی رہ گئے۔ اس ریاست میں روپیہ نہ چلتا تھا۔ راجہ سے لیکر غریب آدمی تک سب کھیتی کا کام کرتے، خود کھاتے اور دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے۔

(۱۰)

ادھر شیطان بیٹھا راہ دیکھ رہا تھا کہ میرے نمائندے تینوں بھائیوں کو تباہ کرکے اب آئے کہ آئے۔ لیکن آتا کون؟ شیطان کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ کیا بات ہے؟ آخر بہت دیر تک غور و فکر کرنے کے بعد وہ خود ان کی تلاش میں روانہ ہوا۔

بلدیو کے پرانے گاؤں میں جاکر اس نے ڈھونڈا، تو اس کو زمین میں تین سوراخ ملے۔ اسے معلوم ہو گیا کہ تینوں بھوت مارے گئے۔ اب وہ ان بھائیوں کی تلاش میں روانہ ہوا، جاکر دیکھا کہ تینوں بھائی راجہ بنے بیٹھے ہیں۔ وہ جل بھن کر راکھ ہی تو ہو گیا۔ دانت پیس کر بولا "دیکھوں تو میرے ہاتھ سے بچ کر

یہ کہاں جاتے ہیں!"

وہ ایک سپہ سالار کا بھیس بدل کر پہلے جسونت کے پاس پہنچا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ "مہاراج! میں نے سنا ہے کہ آپ بڑے بہادر ہیں اور بہادروں کے قدردان بھی۔ میں جنگ و جدل میں بڑا ماہر ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپکی خدمت کر کے اپنے کمالات کا مظاہرہ کروں۔"

جسونت اس کے تیوروں ہی سے تاڑ گیا کہ آدمی ہوشیار اور عقلمند ہے اسے فوراً اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔

نیا سپہ سالار فوج کو بڑھانے کا انتظام کرنے لگا۔ جسونت سے کہا۔

"مہاراج! میرے خیال میں ملک میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کچھ کام نہیں کرتے سلطنت کا استحکام فوج ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے ایک تو تمام بیکار نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کر کے فوجی طاقت پہلے سے پانچ گنا کر دینی چاہیئے۔ دوسرے نئے نمونے کی بندوقیں اور توپیں بنانے کے لئے کارخانے قائم کرنے چاہئیں۔ میں ایک فائر میں سو گولیاں چلانے والی اور گھوڑے، مکان اور پل وغیرہ تباہ و برباد کر دینے والی توپیں بنا سکتا ہوں۔"

جسونت نے فوراً تمام سلطنت میں حکم جاری کر دیا کہ سب نوجوان فوج میں بھرتی ہوں۔ جگہ جگہ نئے نمونے کی توپیں اور بندوقیں تیار کرنے کے کارخانے قائم کر دئیے۔ جنگ کا تمام سامان جمع ہوتے پر اس نے ہمسایہ راجہ پر حملہ کر کے اس کا علاقہ چھین لیا اور پھر راناگڑھ کی ریاست کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

لیکن بدقسمتی سے راناگڑھ کے راجہ نے جسونت کی جنگی تیاریوں اور جدید

کے تمام حالات سن لئے تھے۔ جسونت نے تو صرف مردوں ہی کو بھرتی کیا تھا، اس نے عورتوں کو بھی فوج میں بھرتی کر لیا۔ نئے نمونے کی بندوقیں اور توپیں بنالیں فوج جسونت کی فوج سے بھی چار گنا بنالی اور ایک ایسی قسم کے گولے بنائے جو آسمان سے گرائے جائیں تو زمین پر آکر دشمن کی فوج کا صفایا کر دیں۔

جسونت سمجھا تھا کہ پڑوسی راجہ کی طرح لمحہ بھر میں رانا گڑھ کی ریاست پر بھی قبضہ کر لوں گا۔ لیکن یہاں نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ اسکی فوج ابھی جنگ کے لئے تیار ہو ئی ہی تھی کہ دشمن کی نسوانی فوج نے آسمان سے بم کے گولے برسانے شروع کر دیئے۔ جسونت کی تمام فوج روئی کے گالوں کی طرح اڑ گئی۔ بیچارہ اکیلا جسونت کیا کر سکتا تھا، بھاگتے ہی بنی اور رانا گڑھ کے راجہ نے اس کے علاقے پر بھی قبضہ کر لیا۔

جسونت کو تباہ و برباد کر کے شیطان دھن راج کی ریاست میں پہنچا، اور سوداگر کا بھیس بنا کر وہاں ایک تجارتی کوٹھی قائم کر لی۔ جو آدمی مال بیچنے آتا۔ وہ چار پانچ گنا زاید قیمت پر اس سے مال خرید لیتا۔ جلد ہی وہاں کی رعایا مالدار ہو گئی۔ دھن راج یہ حال دیکھکر بڑا خوش ہوا کہ اس سوداگر کے آنے سے میرا خزانہ بھر گیا ہے کسی بات کی کمی نہیں رہی۔

اب دھن راج نے ایک نیا محل بنانے کی تیاری کی۔ اسے یقین تھا کہ روپے کے لالچ سے معمار، مزدور اور مسالہ سب کچھ فوراً مل جائے گا۔ کوئی دقت پیش نہ آئیگی۔ لیکن کوئی بھی اس کا محل بنانے کے لئے نہ آیا۔ شیطان سوداگر کے پاس روپے کا شمار نہ تھا۔ اس کے مقابلے میں راجہ زیادہ اجرت نہ دے سکتا تھا۔ اس کا محل

نامکمل ہی رہا اور اُسے پرانے محل ہی میں رہنا پڑا۔

اس کے بعد اس نے ایک باغ بنانا شروع کیا تو اس سوداگر نے تالاب بنوانا شروع کر دیا۔ سب لوگ سوداگر کے بس میں تھے۔ کوئی بھی راجہ کا کام نہ کرتا تھا۔ ناچار باغ بھی ویسے ہی رہ گیا۔

سردیوں کے موسم میں دھن راج نے نئے گرم کپڑے خریدنے کا ارادہ کیا۔ تمام علاقہ چھان مارا لیکن ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ سوداگر نے کوئی کپڑا نہیں چھوڑا، سب کے سب خرید کر لے گیا ہے۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ روپے کے زور سے شیطان نے دھن راج کے تمام ملازم بھی اپنے پاس کھینچ لئے اور راجہ بھوکوں مرنے لگا۔ غضبناک ہو کر اس نے سوداگر کو اپنی ریاست سے نکال دیا۔ شیطان نے سرحد پر جا کر ڈیرہ جما لیا۔ دھن راج کے لئے کچھ نہ بنتی تھی۔ اسے تین دن فاقہ سے گزرے تھے کہ جسونت بحال تباہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور کہا :-

" بھائی دھن راج ! میں تو مر چکا۔ میری فوج اور ریاست سب تباہ ہو گئی۔ راناگڑھ کے راجہ نے میری ریاست پر قبضہ کر لیا ہے۔ بھاگ کر تمہارے پاس آیا ہوں، میری کچھ مدد کرو۔"

دھن راج نے منہ بسور کر کہا۔ "مدد کی ایک ہی کہی! یہاں خود اپنی جان پر آبنی ہے۔ تین دن سے فاقہ سے ہوں۔ کھانے کو دانہ تک نصیب نہیں تمہاری مدد کیسے کروں ؟"

(۱۱)

جسونت اور دھن راج کو اس حال تک پہنچا کر شیطان اب کرنل کا بھیس بدل کر راجہ بلدیو کے پاس پہنچا اور عرض کی :-

" مہاراج ! فوج کے بغیر حکومت کی شان اور سلطنت کی حفاظت نہیں کی جاسکتی۔ اگر حکم دیں تو ایک زبردست فوج تیار کردوں !"

بلدیو نے کہا ۔" بہت بہتر، فوج تیار کرو اور اسے گانا بجانا سکھاؤ۔ مجھے گانا بہت پسند ہے اور رزمیہ گانا تو انتہائی مرغوب ہے۔ فوج تیار کر کے اسے صرف باجا بجانا سکھانا اور کچھ نہیں ۔"

شیطان لوگوں کے پاس جا کر انہیں سمجھانے لگا ۔کہ" تم سپاہی بن جاؤ۔ تمہیں کپڑے اور اناج دیا جائیگا ۔"

لوگوں نے جواب دیا ۔کہ" ہمارے پاس اناج بہت ہے۔ عورتیں سوت کات لیتی ہیں کپڑے بن جاتے ہیں، سی بھی وہ خود لیتی ہیں۔ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں، جاؤ اپنا کام کرو، ہم سپاہی نہیں بنتے ۔"

شیطان بلدیو کے پاس آکر بولا ۔" مہاراج ! آپکی رعایا بڑی بیوقوف ہے۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ وہ سرکاری حکم کے بغیر بھرتی نہ ہوگی۔ یہ حکم جاری کر دیا جائے ۔کہ جو آدمی سپاہی نہ بنے گا، اسے پھانسی دے دی جائیگی ۔"

راجہ نے حکم جاری کر دیا ۔لوگ شیطان کے پاس آکر کہنے لگے :-

" تم کہتے ہو کہ اگر فوج میں بھرتی نہ ہونگے تو جان سے مار دئے جائینگے ذرا یہ بتاؤ کہ بھرتی کے بعد کیا ہوگا؟ ہم نے سنا ہے کہ لڑائی میں

سپاہیوں کو مار دیا جاتا ہے۔"

"ہاں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔"

"جب مرنا ہی ہے تو گھر میں کیوں نہ مریں؟ میدانِ جنگ میں مارے جانے سے کیا حاصل؟ جاؤ ہم بھرتی نہیں ہوتے۔"

"تم تو بیوقوف ہو" شیطان نے کہا۔ "یہ بات تو نہیں کہ لڑائی میں مارے ہی جاؤ گے! بچ بھی سکتے ہو۔ لیکن اگر سپاہی نہ بنو گے تو تمہیں ضرور پھانسی دی جائے گی۔"

لوگ خوفزدہ ہو کر بلدیو کے پاس پہنچے اور بولے:۔

"مہاراج! ایک سپہ سالار ہمیں بڑی عجیب بات سناتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اگر ہم سپاہی نہ بنیں گے تو آپ ہمیں ضرور پھانسی دے دینگے۔ کیا یہ بات سچ ہے؟"

بلدیو نے مسکرا کر کہا۔ "ذرا سوچو تو، میں اکیلا تم کو کیسے پھانسی دے سکتا ہوں؟"

"تو پھر ہم سپاہی کیوں بنیں؟"

"نہ بنو، تمہاری مرضی!"

لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ شیطان بڑا مایوس ہوا کہ یہ منتر تو نہ چلا۔ اچھا پڑوسی راجہ کے یہاں چل کر اسے یہ پٹی پڑھاتا ہوں، کہ ایسے بیوقوف راجہ کا ملک چھین لے۔"

چنانچہ ہمسایہ ملک کے راجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے عرض

کی "مہاراج! راجہ بلدیو کے ملک میں اناج اور جانور بہت ہیں۔ روپیہ نہیں تو کیا ہوا۔ آپ حملہ کرکے اس کا ملک چھین لیں۔"

اُدھر بلدیو کی رعایا یہ خبر پاکر بلدیو کے پاس پہنچی کہ "مہاراج! فلاں ملک کا راجہ لڑائی کے لئے آ رہا ہے۔"

بلدیو نے کہا۔ "آنے دو، ہمارا کیا نقصان ہے؟"

ہمسایہ ملک کے راجہ نے بلدیو کے ملک کے راز معلوم کرنے کے لئے کچھ سپاہی بھیجے۔ وہاں فوج ہی کہاں تھی؟ راز کس کا معلوم کریں؟ وہ واپس چلے گئے۔ اس راجہ نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ جاکر بلدیو کے ملک کو تاخت و تاراج کردے۔ سپاہی وہاں پہنچکر اناج، کپڑے اور جانور وغیرہ لوٹنے لگے۔ بلدیو کی رعایا نے کسی کا مقابلہ نہ کیا۔ کسی سے کچھ نہ بولے۔ بلکہ سپاہیوں کی خدمت کرنے لگے اور کہا: "بھائیو! اگر تمہیں اپنے ملک میں کوئی تکلیف ہو تو یہاں آکر ہمارے ساتھ رہو۔"

اب سپاہی سوچنے لگے کہ جنگ کریں تو کس سے؟ یہاں کے لوگ تو خود ہی سب کچھ دینے کو تیار ہیں۔ اپنے راجہ کے پاس جاکر بولے "مہاراج بلدیو کی رعایا تو سب کچھ دینے کو تیار ہے۔ لڑائی کس سے کی جائے؟" راجہ نے کہا "کچھ پروا نہیں۔ جاؤ گاؤں جلا دو، جانوروں کو قتل کر ڈالو، ہم لڑائی ضرور کریں گے۔ اگر میرا حکم نہیں مانوگے۔ تو تمہیں توپ دم کر دیا جائیگا"

سپاہی خوفزدہ ہوکر پھر گئے اور گاؤں وغیرہ جلانے لگے۔ بلدیو کی رعایا نے نہایت محبت سے انہیں کہا۔ "ایسی اچھی چیزوں کو جلانے اور

تباہ و برباد کرنے سے آپ لوگوں کو کیا حاصل ہوگا؟ اگر تم چاہو تو یہ سب چیزیں اپنے مالک ہیں سے جاؤ۔ ہمیں کوئی رنج نہ ہوگا۔ لیکن اس طرح جانوروں کو قتل کرنے سے ہمیں تکلیف پہنچتی ہے۔"

آخر فوج کو رعایا پر رحم آگیا۔ وہ راجہ کی ملازمت ترک کر کے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بلدیو بدستور حکومت کرتا رہا۔

(۱۲)

شیطان سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اس بے وقوف نے تو بڑا تنگ کیا ہے۔ سچ ہے عقلمندوں کو بس میں کر لینا آسان ہے۔ لیکن احمق کو سمجھانا دشوار ہے۔ اچھا کسی بزرگ کی صورت بنا کر اس کے پاس چلتا ہوں۔ شاید راہ پر آ جائے۔

وہ بھیس بدل کر بلدیو کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا:۔

" مہاراج! میری خواہش ہے کہ آپ کی راجدھانی میں کاروبار کو وسعت دوں۔ تجارت سے انسان عقل مند اور ہوشیار ہو جاتا ہے۔"

بلدیو نے کہا۔" بڑی اچھی بات ہے۔ بڑی خوشی سے تجارت کو فروغ دو۔"

دوسرے دن شیطان ایک سنہری تھیلا لیکر چوک میں پہنچا۔ اور اشرفیاں دکھا کر لوگوں سے کہنے لگا کہ جو آدمی میرا کام کرے گا اسے یہ انعام دی جائینگی۔ وہاں کی بیوقوف رعایا اشرفیوں کا نام تک نہ جانتی تھی۔ سونے کے خوبصورت ٹکڑے دیکھ کر وہ خوش ہو گئے اور شیطان کا

کا کام کرنے لگے۔

شیطان سمجھا کہ دھن راج والا منتر چل گیا۔

کچھ عرصہ تک لوگ شیطان کا کام کرتے رہے۔ اسے غلہ اور کپڑے بھی دیتے رہے جب ان کے پاس بہت اشرفیاں ہو گئیں اور انہوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو زیور بنوا دیئے تو انہوں نے شیطان کا کام کرنا چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کے ہاتھ آٹا دال تک بیچنا بند کر دیا۔

شیطان کی عجیب حالت ہوئی۔ ایک دن وہ ایک کسان کے گھر جا کر کہنے لگا " بھائی اس اشرفی کے عوض مجھے آدھ سیر آٹا تو دے دو" کسان نے کہا " اشرفی لے کر کیا کرونگا۔ اشرفیاں تو پہلے ہی بہت پڑی ہیں میں آٹا نہیں بیچتا۔ البتہ اگر خدا کے نام پر مانگو تو دینے کو تیار ہوں"

شیطان کانپ اٹھا اور بھاگ کر دوسرے کسان کے پاس پہنچا۔

وہاں بھی وہی حال ہوا۔ آخر بیچارے کو رات بھر بھوکا ہی سونا پڑا۔

رعایا بادیو کے پاس آکر کہنے لگی " مہاراج! ایک امیر آدمی آیا ہے۔ وہ کوٹ اور پتلون پہنے رہتا ہے۔ کھانا پینا خوب ہے۔ کام کچھ نہیں کرتا اشرفیاں لئے پھرتا ہے۔ اگر ہم خدا کے نام پر اسے اناج وغیرہ دینا چاہتے ہیں تو نہیں لیتا، اشرفیاں دکھاتا ہے۔ اناج بیچنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اور اسے بھوکا رکھنا بھی مناسب نہیں۔ آپ ہی بتائیں کیا کیا جائے؟ اس طرح تو وہ بھوکوں مر جائے گا"

" اسے کھانا تو دینا ہی پڑے گا" بادیو نے کہا " باری مقرر کر لو۔ ایکدن

ایک گھر سے کھانا دے دیا کرو۔"

اب شیطان باری باری گھر گھر جا کر کھانا کھانے لگا۔ ہوتے ہوتے ایک دن راجہ بلد یو کے گھر کی باری آگئی۔ وہاں جا کر دیکھتا کیا ہے کہ بلدیو کی گونگی بہن شیلا روٹی پکا رہی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ نکمے لوگ رسوئی میں آکر کھانا لے لیا کرتے تھے۔ اس لئے شیلا نے یہ اصول مقرر کر رکھا تھا کہ جن کے ہاتھ کام کرنے سے سخت ہو گئے ہوں وہی لوگ رسوئی میں بیٹھ کر کھانا کھایا کریں اور کوئی نہیں۔

شیطان کو بات معلوم نہ تھی۔ وہ جھٹ سے رسوئی میں جا کر بیٹھ گیا گونگی شیلا نے اسے وہاں سے اٹھا دیا۔ رانی بولی :-

" حضرت! برا نہ ملنیئے، یہاں کا اصول ہی یہی ہے کہ نرم و نازک ہاتھوں والوں کو پس خوردہ کھانا دیا جاتا ہے۔ آپ باہر بیٹھیں جو کچھ بچے گا وہ آپ کو مل جائے گا۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بلدیو وہاں آپہنچا۔

شیطان نے اس سے کہا۔ "آپ کے راج میں یہ انوکھا رواج ہے کہ ہر شخص کو اپنے ہاتھوں سے کام کرنا چاہیئے۔ کام کیا صرف ہاتھوں ہی سے کیا جاتا ہے؟ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہوشیار آدمی کس طرح کام کرتے ہیں؟"

بلدیو نے کہا۔ " بھلا ہم بیوقوف آدمی کیا جانیں۔ ہم تو صرف ہاتھوں ہی سے کام کرتے ہیں۔"

شیطان نے کہا۔" اسی لئے تو آپ لوگ بیوقوف ہیں۔ اب میں آپ کو

دماغ سے کام کرنا بتاؤں گا، جب آپ کو معلوم ہو گا کہ دماغ سے کام کرنا ہاتھوں سے کام کرنے کی نسبت کہیں زیادہ مفید ہے۔"

"او ہو، تو ہم لوگ یقیناً بیوقوف ہیں۔" بلدیو نے کہا۔

"دماغ سے کام کرنا آسان نہیں" شیطان نے کہا۔ "آپ مجھے اس لئے رسوئی میں بٹھا کر کھانا نہیں کھلاتے کہ میرے ہاتھ نرم ہیں اور میں ہاتھوں سے کام نہیں کرتا۔ لیکن سچ کہتا ہوں کہ دماغ کے ذریعے کام کرنا بے حد دشوار ہے یہاں تک کہ کبھی کبھی دماغ پھٹنے لگتا ہے۔"

"تو دوست ایسی تکلیف کیوں اٹھاتے ہو؟ دماغ پھٹنا کیا اچھا معلوم ہوتا ہے؟ ہاتھوں سے نہایت آسانی کے ساتھ کام کیوں نہیں کر لیتے؟"

شیطان نے کہا۔ "مجھے آپ لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر ترس آتا ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کو بھی یہ کام سکھا دوں۔"

بلدیو نے مسرورانہ کہا۔ "ہاں ہاں، ضرور سکھلایئے۔ کام کرتے کرتے جب ہمارے ہاتھ تھک جایا کریں گے تو ہم دماغ سے کام لیا کریں گے۔"

دوسرے دن بلدیو نے تمام ریاست میں اعلان کر دیا کہ ایک بزرگ ——— ایک مہاتما، دماغ سے کام کرنا سکھائیں گے۔ کیونکہ اس طرح کام کرنا نہایت فائدہ مند ہے۔ سب لوگ آکر ان کا وعظ سنیں۔"

لوگوں کے گروہ کے گروہ آنے لگے۔ ایک میلہ سا لگ گیا۔ بلدیو نے شیطان مہاراج کو ایک بہت اونچے برج پر چڑھا دیا تاکہ لوگ اسے اچھی طرح دیکھ سکیں۔ اس برج پر ایک لیمپ بھی روشن تھا۔

شیطان چوٹی پر چڑھ کر وعظ کرنے لگا لوگ سمجھتے تھے کہ وہ دماغ سے کام کرنے کی تدابیر بتلائے گا۔ لیکن وہ خالی گپیں ہانکنے لگا، کہ "ہاتھوں سے کام کئے بغیر انسان بڑے آرام سے رہ سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب لوگ ہاتھوں سے کام کریں۔" لوگ ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکے اور مایوس ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

شیطان کئی دن تک برج پر بیٹھا بکتا جھکتا رہا۔ آخر اسے بھوک ستانے لگی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ جب دماغ سے کام کرنا، ہاتھوں سے کام کرنے کی نسبت، بہت اعلیٰ ہے تو اسے کھانے کی کیا کمی ہو سکتی ہے، اس لئے انہوں نے کھانا نہ پہنچایا۔

بلدیو نے رعایا سے پوچھا۔ "کیا مہاتما نے دماغ سے کام کرنا شروع کر دیا؟"

سب نے جواب دیا "مہاراج! ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ وہ تو خالی گلا پھاڑے جاتا ہے۔ وہ ہمیں سکھاتا تو کچھ نہیں۔"

تیسرے دن شیطان بھوک اور پیاس سے بدحال ہو کر برج سے نیچے گر پڑا — لڑھکتا ہوا دھم سے زمین پر آ رہا، اور اس کا دماغ پھٹ گیا۔

لوگوں نے دوڑ کر رانی کو اطلاع دی۔ رانی دوڑتی ہوئی کھیت پر پہنچی بیوقوف راجہ بلدیو اس وقت کھیت میں ہل چلا رہا تھا۔

رانی نے کہا "مہاراج جلد چلیئے۔ وہ مہاتما دماغ سے کام کرنے لگا ہے۔"

بلدیو کام چھوڑکر رانی کے ہمراہ وہاں پہنچا تو دیکھا ـــــ کہ حضرت زمین پر پڑے ہیں اور دماغ پھٹ گیا ہے۔

بلدیو نے لوگوں سے کہا" بھائیو! مہاتما سچ کہتا تھا کہ دماغ سے کام کرتے کرتے دماغ پھٹ جایا کرتا ہے۔ دیکھو آخر بچارے کا دماغ پھٹ ہی گیا۔"

بلدیو چاہتا تھا کہ پاس جاکر دیکھیں اس نے کتنا کام کیا ہے۔ لیکن اتنے میں شیطان اپنی شیطانی قوت کے زور سے زمین میں سما گیا اور وہاں صرف چھوٹا سا گڑھا رہ گیا۔

بلدیو نے کہا" اوہو! یہ تو بھوت تھا معلوم ہوتا ہے، یہ ان تینوں کا باپ تھا۔"

بلدیو ابھی تک زندہ ہے۔ اس کی سلطنت کی آبادی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ جسونت اور دھن راج بھی اس کے پاس آکر رہنے لگے ہیں مہمانوں کی خاطر تواضع اس نے اپنا ایمان بنا رکھا ہے۔

اس سلطنت میں بھی ایک عجیب رسم ہے کہ لوگوں کے ساتھ رسوئی میں بیٹھ کر صرف وہی شخص کھانا کھا سکتا ہے جس کے ہاتھ سخت ہوں۔ دوسروں کو پس خوردہ نصیب ہوتا ہے۔

افغان قیدی

دلاور بیگ ایک سرحدی رجمنٹ میں ملازم تھا۔ ایک دن بنوں سے ماں کا خط موصول ہوا کہ ——"میں بوڑھی ہوتی جاتی ہوں۔ مرنے سے پیشتر ایک بار تمہیں دیکھنے کی تمنا ہے۔ چند دن کی رخصت لے کر ماں کی دعائیں لے جاؤ اور میری تجہیز و تکفین کر کے پھر آرام سے ملازمت پر چلے جانا۔ میں نے تمہارے لئے ایک لڑکی بھی دیکھ رکھی ہے۔ وہ بڑی عقل مند اور سلیقہ شعار ہے۔ اگر تم پسند کرو تو اس سے شادی کر لینا —— مرتے وقت تمہارے سر پر سہرا بھی دیکھ جاؤں۔"

دلاور بیگ نے سوچا —— ٹھیک ہی ہے۔ ماں اب بوڑھی ہے زندگی کا کیا بھروسہ؟ شاید پھر اُن کی زیارت نہ کر سکوں۔ اسلئے جانا ہی مناسب ہے۔ اس نے جرنیل سے کہہ کر پندرہ دن کی رخصت حاصل کی اور ساتھیوں سے مل کر روانگی کے لئے تیار ہو گیا۔

اُن دنوں سرحدی قبائل کے حملے عام تھے۔ اکیلے سفر کرنا زندگی کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ سرحدی اکیلے دُکیلے مسافر تو کجا۔ لاری تک کو لوٹ لیتے تھے اور لوگوں کو قیدی بنا کر لے جاتے تھے۔ دلاور بیگ اگرچہ سپاہی تھا۔

"تاہم اس نے اکیلے سفر کرنے کی بجائے چند ساتھی تلاش کرنا بہتر سمجھا۔ اتفاق سے کچھ اور سپاہی بھی اسی سمت جانے والے مل گئے۔

رات کے گیارہ بجے سب روانہ ہوئے۔ دلاور بیگ اپنے گھوڑے پر سب سے آگے تھا۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ آخر ماہ کا چھوٹا سا چاند ضیاپاشی میں مصروف تھا۔ لیکن اس کی چاندنی اندھیرے کو کم کرنے کی بجائے اور بھیانک بنا رہی تھی۔ لمبے لمبے سائے دیو معلوم ہوتے تھے۔ دلاور کا گھوڑا بار بار آگے نکل جاتا تھا اور وہ کچھ دور آگے نکل کر ہمراہیوں کے انتظار میں ٹھہر جاتا تھا۔

جب نصف سے زاید راستہ کٹ گیا تو اس نے دل میں سوچا ——
آگے کیوں نہ نکل چلوں۔ گھوڑا تیز ہے۔ اگر کوئی سرحدی گروہ مل گیا تو گھوڑا دوڑا کر نکل جاؤں گا۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ غلام قادر نے گھوڑا اس کے ساتھ آملایا اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ بولا "آؤ آگے چلیں۔ ہوا بند ہے۔ سخت پیاس محسوس ہو رہی ہے۔"

غلام قادر بھاری بھر کم آدمی تھا۔ چہرہ سرخ و سفید! اور اس وقت پسینے سے تر ہو رہا تھا۔

دلاور بیگ نے پوچھا۔ "تمہاری بندوق بھری ہوئی ہے؟"

"ہاں بھری ہوئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا چلو! لیکن پیچھے نہ رہ جانا۔"

دونوں چل دیئے ——— ساتھی ابھی بہت پیچھے تھے۔ دونوں باتیں کرتے جاتے تھے۔ لیکن دھیان دائیں بائیں تھا۔ صاف جگہ ہونے کے باعث چاروں طرف نگاہ جا سکتی تھی۔ آگے چل کر سڑک دو پہاڑیوں کے درمیان میں سے گزرتی تھی۔

دلاور بیگ نے کہا۔ "اس پہاڑی پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھ لینا چاہیئے ایسا نہ ہو پٹھان اچانک حملہ کر دیں۔"

"اجی چلیے بھی چلو" غلام قادر اینٹھ کر بولا۔

دلاور نے کہا۔ "نہیں، تم یہاں ٹھہرو۔ میں جا کر دیکھ آتا ہوں۔"

یہ کہکر اس نے گھوڑا پہاڑی کی طرف پھیر دیا۔ شکاری گھوڑا اسے تیر کیطرح لے اُڑا۔ ابھی وہ پہاڑی کی چوٹی پر نہ پہنچا تھا کہ سو قدم کے فاصلے پر تین پٹھان دکھائی دیئے۔ دلاور بیگ جلدی سے واپس پھرا لیکن پٹھانوں نے دیکھ لیا اور بندوقیں سنبھال کر گھوڑے تعاقب میں دوڑا دیئے۔ دلاور بے تحاشا پہاڑی سے نیچے اُترا اور غلام قادر کو پکار کر کہا۔ "بندوق تیار رکھو" اور گھوڑے سے بولا "میرے عزیز رفیق! اب وقت ہے، دیکھنا ٹھوکر نہ کھانا۔ ورنہ قصّہ ختم ہو جائے گا۔ ایک بار بندوق لے لینے دے، پھر میں کسی کے قابو نہیں آسکتا۔"

اُدھر غلام قادر پٹھانوں کو دیکھتے ہی گھوڑے کو چابک مار کر اس طرح بھاگا۔ کہ پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔

دلاور بیگ نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی امید نہیں بندوق بھی پاس نہیں

خالی تلوار سے کیا کام بنے گا۔ وہ واپس ساتھیوں کی طرف بھاگا۔ لیکن چھ پٹھان اس پر ٹوٹ پڑے۔ دلاور کا گھوڑا تیز تھا۔ لیکن ان کے گھوڑے اس سے بھی تیز تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ وہ سامنے سے آرہے تھے۔ دلاور یہ چاہتا تھا۔ کہ گھوڑے کی باگ موڑ کر اسے دوسرے راستے پر ڈال دے۔ لیکن گھوڑا اتنا تیز تھا کہ رُک نہ سکا۔ سیدھا پٹھانوں سے جا ٹکرایا۔

سبزے گھوڑے پر سوار، بندوق اٹھائے ایک سرخ ریش پٹھان دانت پیستا ہوا اس کی طرف لپکا۔ دلاور جانتا تھا کہ اگر وہ زندہ گرفتار ہو گیا تو کسی غار میں پھینک کر کوڑے مار کر ینگے۔ اس لئے یا تو آگے نکلنا چاہیئے یا ایک دو کو مار کر خود بھی جان دے دینی چاہیئے۔ قید کی زندگی سے مرنا بہتر۔ اب پٹھانوں اور دلاور بیگ میں دس ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ عقب سے گولی چلی۔ اس کا گھوڑا زخمی ہو کر گرا اور وہ بھی اس کے ساتھ ہی زمین پر آرہا۔

دلاور اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دو پٹھان آکر اس کی مشکیں کسنے لگے دلاور بیگ نے انہیں دھکا دے کر گرا دیا۔ لیکن اتنے میں دوسرے پٹھان گرد جمع ہو گئے اور اسے بندوق کے کندوں سے مارنا شروع کر دیا — وہ زخمی ہو کر پھر گر پڑا۔ پٹھانوں نے اس کی مشکیں کس لیں۔ کپڑے پھاڑ دیئے اور سب روپیہ پیسہ چھین لیا۔

دلاور نے دیکھا۔ کہ گھوڑا جہاں گرا تھا، وہیں پڑا ہے۔ ایک پٹھان نے قریب جا کر زین اتارنی چاہی۔ گولی گھوڑے کے سر میں لگی تھی۔ اس

ہیں سے سپاہی کا بل خون بہہ رہا تھا۔ دو ہاتھ ادھر ادھر کی زمین کیچڑ ہو گئی تھی اور گھوڑا چت پڑا ہوا ہیں پیر پٹک رہا تھا۔ پٹھان نے اس کے گلے پر تلوار پھیر دی اور زین اتار لی۔

لال داڑھی والا پٹھان گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دو تین پٹھانوں نے مل کر دلاور کو اس کے پیچھے بٹھا کر اس کی کمر سے باندھ دیا اور جنگل کی راہ لی۔ دلاور بے حال ہو رہا تھا۔ خون بہہ کر آنکھوں پر جم گیا تھا۔ رسی سے اس کا کندھا زخمی ہوا جا رہا تھا۔ وہ ہل جل نہیں سکتا تھا۔ اس کا سر بار بار پٹھان کی پیٹھ سے ٹکراتا تھا۔ پٹھان پہاڑی پر چڑھتے اترتے آخر ایک ندی پر پہنچا۔ اسے پار کر کے ایک گھاٹی ملی۔ دلاور بیگ یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اگلے دن شام کے قریب پٹھان ایک اور ندی پار کر کے ایک پتھریلی سطح مرتفع پر چڑھ گئے یہاں دور سے دھواں نظر آتا تھا اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی تھی جیسے تھوڑی ہی دور بستی ہو۔ چند لمحے چلنے کے بعد گاؤں آ گیا پٹھانوں نے گھوڑے چھوڑ دیئے۔ دلاور بیگ کو ایک طرف زمین پر بٹھا دیا۔ بچے آ کر اس پر پتھر پھینکنے لگے۔ ایک پٹھان نے انہیں وہاں سے بھگا دیا۔ لال داڑھی والے نے ایک نوکر کو بلایا۔ وہ ایک دبلا پتلا آدمی تھا۔ اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ پٹھان نے اس سے کچھ کہا۔ وہ جا کر بیڑی اٹھا لایا۔ پٹھان نے دلاور کی مشکیں کھول کر اس کے پاؤں میں

بیڑی ڈال دی اور اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر کے تالا لگا دیا۔

(۲)

اس رات دلاور بیگ لمحہ بھر کے لئے بھی نہ سو سکا۔ موسم گرما میں راتیں مختصر ہوتی ہیں۔ جلد ہی صبح ہو گئی۔ دیوار میں ایک جھروکہ تھا جس سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس جھروکے کے ذریعے دلاور بیگ نے دیکھا کہ پہاڑی کے نیچے ایک سڑک اُتری ہے۔ دائیں طرف ایک پٹھان کا جھونپڑا ہے اس کے سامنے دو درخت ہیں۔ دروازے پر ایک سیاہ رنگ کا کتا بیٹھا ہے ایک عورت رنگین کپڑے پہنے پانی کا برتن اٹھائے ایک بچے کی انگلی پکڑے جھونپڑے کی طرف آ رہی ہے۔ اس کے اندر جاتے ہی لال داڑھی والا پٹھان چمکیلے کپڑے پہنے چاندی کے دستے کی تلوار لٹکائے باہر آیا اور ملازم سے کچھ کہکر چل دیا پھر دو بچے گھوڑوں کو پانی پلا کر واپس آتے ہوئے دکھائی دئیے۔ اتنے میں کچھ بچے کوٹھڑی کے قریب آ کر جھروکے میں ٹہنیاں ڈالنے لگے۔ پیاس کے مارے دلاور بیگ کا حلق خشک ہوا جاتا تھا۔ اس نے انہیں پکارا لیکن وہ بھاگ گئے۔

اتنے میں کسی نے کوٹھڑی کا تالا کھولا۔ لال داڑھی والا پٹھان اندر آیا۔ اس کے ساتھ ایک پست قامت آدمی تھا۔ سانولا رنگ، شفاف آنکھیں، بھرے ہوئے رخسار، کٹی ہوئی باریک داڑھی تھی، وہ خوش مزاج اور ہنسوڑ معلوم ہوتا تھا۔ یہ آدمی لال داڑھی والے سے زیادہ اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ چاندی کے میان والی تلوار اور اعلےٰ جوتا۔ لال داڑھی والا

پٹھان کچھ بڑبڑاتا، دلاور بیگ کو کنکھیوں سے دیکھتا ہوا دروازے پر کھڑا رہا۔ سانولا آدمی آکر دلاور بیگ کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور آنکھیں مٹکا کر بڑی جلدی جلدی پشتو میں کہنے لگا۔ "بڑا اچھا فوجی جوان ہے۔"

دلاور بیگ ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا۔ اس نے ان سے پانی مانگا۔ سانولے رنگ کا آدمی ہنسا۔ دلاور بیگ نے ہونٹوں اور ہاتھوں کے اشارے سے بتایا کہ اسے پیاس لگی ہے۔ سانولے رنگ کے آدمی نے پکارا۔ "ستارہ خانم!"

ایک چودہ پندرہ سال کی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ گندمی رنگ، دُبلی پتلی، سیاہ چمکیلی آنکھیں اور سڈول بدن؛ وہ سانولے مرد کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ باپ کا حکم سن کر وہ پانی کا ایک لوٹا لے آئی۔ اور حیران سی ہو کر دلاور کی طرف دیکھنے لگی۔

پھر خالی لوٹا لے کر وہ ایسی تیزی سے باہر بھاگ گئی۔ جیسے ـــــ جھونکا ہوا کا تھا، اِدھر آیا اُدھر گیا ـــــ سانولا آدمی بے اختیار ہنس پڑا اور دلاور متحیر زدہ سا دروازے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کیلئے روٹی لے آئی۔ پھر سب باہر چلے گئے۔ اور کوٹھڑی کو تالا لگا دیا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک خادم نے آکر پشتو میں کچھ کہا ـــــ دلاور نے اس کے اشارے سے اندازہ کیا کہ ساتھ چلنے کو کہہ رہا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ بیڑی کے باعث وہ لنگڑا کر چلتا تھا۔ باہر آکر اس نے دیکھا کہ دس پندرہ گھروں کا ایک گاؤں سا ہے۔ ایک مکان کے سامنے تین لڑکے تین گھوڑے پکڑے کھڑے ہیں۔

سانولا آدمی باہر آیا۔ اور دلاور کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ دلاور نے اندر جاکر دیکھا کہ مکان اچھا صاف ستھرا ہے۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ پتھروں کے چبوترے پر کھال بچھی ہوئی ہے اور تکیے لگے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر شکاری جانوروں کے سر بھی لگے ہوئے ہیں۔ ان کے نیچے چاندی سے منقش بندوقیں، پستول، اور تلواریں لٹک رہی ہیں۔ چبوترے پر پانچ پٹھان بیٹھے ہیں ـــــ ایک وہ لال داڑھی والا، ایک سانولے رنگ کا پستہ قامت اور تین اور۔ سب کھانا کھا رہے ہیں۔

دلاور ایک طرف بیٹھ گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ایک آدمی فارسی میں بولا:۔

" دیکھو نوجوان! تمہیں گل زمان نے پکڑا ہے۔ (سانولے مرد کی طرف انگلی سے اشارہ کرکے) اور علی شبیر کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ اس لئے اب علی شبیر تمہارا مالک ہے۔"

دلاور بےبس خاموش رہا اور علی شبیر ہنسنے لگا۔

اسی پٹھان نے پھر کہا۔" وہ کہتا ہے کہ گھر سے روپے منگالو۔ زرِ فدیہ ادا کرنے پر تمہیں چھوڑ دیا جائیگا۔"

" کتنے روپے ؟" دلاور نے پوچھا۔

" تین ہزار!"

" میں تین ہزار روپیہ نہیں دے سکتا۔"

" کتنا دے سکتے ہو؟"

"صرف پانسو۔"

یہ سن کر پٹھان سٹپٹائے۔ علی شیر، گل زمان سے تکرار کرنے لگا اور اتنی تیزی سے بولنے لگا کہ اس کے منہ سے کف جاری ہوگئی۔ گل زمان نے آنکھیں جھکا لیں۔

تھوڑی دیر پٹھان خاموش رہے اور پھر "تجارتی" گفتگو کرنے لگے۔

ایک پٹھان نے دلاور سے کہا۔ "پانسو روپے سے کام نہیں چل سکتا۔ گل زمان کو علی شیر کا روپیہ ادا کرنا ہے۔ پانسو روپے ہیں تو گل زمان نے تمہیں دیا ہے تین ہزار سے کم نہیں ہوسکتا۔ اگر روپیہ نہ منگواؤ گے۔ تو تمہیں کوڑے مارے جائیں گے۔"

دلاور نے سوچا۔ کہ جتنا ڈرو گے، اتنا ہی یہ ظالم دھمکائیں گے۔ وہ کھڑا ہوکر بولا:۔

"اس شریف آدمی سے کہدو کہ اگر مجھے کوڑوں کا رعب دے گا۔ تو میں گھر والوں کو کچھ نہیں لکھوں گا ـــ میں تم سے ذرا نہیں ڈرتا۔"

علی شیر نے کہا۔ "اچھا ایک ہزار منگواؤ۔"

"پانسو سے ایک کوڑی زیادہ نہیں"۔ دلاور بیگ نے کہا۔ "اگر تم مجھے مار ڈالو گے تو پانسو سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔"

یہ سنکر پٹھان پشتو میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔ اتنے میں ایک ملازم ایک اور آدمی کو ساتھ لئے اندر آیا۔ وہ موٹا تازہ آدمی تھا۔ ننگے پاؤں اور بیڑی پڑی ہوئی۔ دلاور بیگ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ غلام قادا

تھا۔ ملازم نے غلام قادر کو دلاور کے پاس بٹھا دیا۔ وہ ایک دوسرے سے اپنی مصیبت کا حال بیان کرنے لگے۔ دلاور نے اپنی داستان سنائی۔ غلام قادر بولا۔ "میرا گھوڑا اڑ گیا۔ بندوق اچٹ گئی اور علی شبیر نے مجھے پکڑ لیا۔"

علی شبیر نے کہا۔ "تم دونوں ایک ہی مالک کے قیدی ہو۔ جو پہلے روپیہ ادا کر دے گا، اُسے رہا کر دیا جائیگا۔ (دلاور سے) دیکھو تم کتنے زرد رنگ ہو اور تمہارا ساتھی کتنا حلیم الطبع ہے۔ اس نے پانچ ہزار روپے بھیجنے کے لئے لکھ دیا ہے۔ اس لیئے اب اسے آرام سے رکھا جائے گا۔"

دلاور نے کہا۔ "میرا ساتھی جو چاہے کرے۔ وُہ دولت مند ہے لیکن میں غریب ہوں۔ میں تو پانسو روپے سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ خواہ جان سے مار ڈالو۔"

پٹھان خاموش ہو گئے۔ علی شبیر فوراً قلمدان اٹھا لایا۔ کاغذ، قلم دوات نکال کر دلاور کی پشت پر پھینکی دی اور لکھنے کو کہا۔ وہ پانسو روپے لینے پر رضامند ہو گیا تھا۔

دلاور نے کہا۔ "ذرا ٹھیرو ——— دیکھو ہمیں نہایت آرام سے رکھنا ہمیں اچھا کھانا وغیرہ دینا۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ رکھنا۔ جس سے ہمارا وقت اچھی طرح کٹ جائے ——— اور ہماری بیڑیاں بھی نکال دو۔"

علی شبیر نے کہا۔ "جیسا کھانا چاہو کھا سکتے ہو۔ البتہ بیڑی اب نہیں اتاری جائے گی۔ تاکہ تم بھاگ نہ جاؤ۔ ہاں رات کو اتار دی جائے گی۔"

دلاور بیگ نے خط لکھ دیا۔ لیکن پتہ بالکل غلط لکھا۔ کیونکہ وہ دل میں فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ کبھی نہ کبھی موقع ملنے پر بھاگ جاؤں گا۔

پٹھانوں نے دونوں کو ایک کوٹھڑی میں پہنچا کر ایک لوٹا پانی اور کچھ مکئی کی روٹیاں دے کر باہر سے تالا لگا دیا۔

(۲۳)

دلاور بیگ اور غلام قادر کو اس طرح پٹھانوں کی قید میں ایک مہینہ گزر گیا۔ علی بشیر انہیں دیکھ کر ہمیشہ ہنستا رہتا تھا۔ لیکن کھانے کو مکئی کی روٹی کے سوا اور کچھ نہ دیتا تھا۔ غلام قادر ہر وقت اداس پڑا رہتا سویا رہتا۔ وہ دن گنا کرتا تھا کہ کب روپیہ آئے اور وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پا کر گھر پہنچے۔ دلاور تو جانتا تھا کہ روپیہ کہاں سے آنا ہے۔ جو کچھ وہ گھر بھیجتا تھا، اس سے ماں مشکل گزارا کرتی تھی۔ وہ پانسو روپیہ کیونکر بھیج سکتی ہے۔ اور پھر اسے خط ملے گا بھی کہاں!! اگر خدا نے کرم کیا تو میں یہاں سے بھاگ نکلوں گا۔ وہ ہر وقت گھات میں لگا رہتا تھا۔ کبھی سیٹی بجاتا ہوا گاؤں کا چکر لگاتا۔ کبھی بیٹھ کر مٹی کے کھلونے اور ٹوکریاں بناتا۔ دستکاری میں وہ ماہر تھا۔

ایک دن اس نے ایک گڑیا بنا کر چھت پر رکھ دی۔ گاؤں کی عورتیں جب پانی بھرنے آئیں تو ستارہ خانم نے انہیں بلا کر گڑیا دکھائی وہ سب ہنسنے لگیں۔ دلاور نے گڑیا سب کو پیش کی لیکن کسی نے بھی نہ لی۔ وہ اسے باہر رکھ کر کوٹھڑی میں چلا گیا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ ستارہ

گڑیا اٹھا کر بھاگ گئی۔

دوسرے روز دلاور نے دیکھا کہ ستارہ دروازے پر بیٹھی گڑیا کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ ایک بڑھیا آئی اور اس نے گڑیا چھین کر توڑ ڈالی ستارہ روتی ہوئی بھاگ گئی۔ دلاور نے ستارہ کو اور گڑیا بنا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک دن چھوٹا سا لوٹا لائی۔ زمین پر رکھا اور دلاور کو اشارہ کر کے بھاگ گئی۔ دلاور نے دیکھا تو اس میں دودھ تھا۔ اب ستارہ ہر روز دلاور کے لئے اچھا کھانا اور دودھ لانے لگی۔

ایک روز سخت آندھی آئی۔ اور اس کے بعد ایک گھنٹہ تک موسلا دھار مینہ برستا رہا۔ ندی نالے بھر گئے۔ بندھ پر سات فٹ پانی چڑھ آیا جگہ جگہ جھرنے جاری ہو گئے۔ بہاؤ اتنا تیز تھا کہ بڑے بڑے پتھر بہہ جاتے تھے۔ گاؤں کی گلیوں میں ندیاں بہنے لگیں۔ آندھی اور بارش تھمنے پر دلاور نے علی شیر سے چاقو منگوا کر ایک پہیہ بنایا اور اس کے دونوں طرف دو گڑیاں باندھ کر پہیے کو پانی میں چھوڑ دیا۔ وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگا۔ سب گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ اور گڑیوں کا رقص دیکھ کر ہنسنے، اور تالیاں بجانے لگے۔

علی شیر کے پاس ایک پرانی بگڑی ہوئی گھڑی پڑی تھی۔ دلاور بیگ نے اسے بھی درست کر دیا۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی اپنی بندوقیں، پستول اور گھڑیاں وغیرہ لا کر اس سے مرمت کروانے لگے۔ اس سے خوش ہو کر علی شیر نے اسے ایک چمٹی، ایک برما اور ایک ریتی دے دی

ایک دن ایک پٹھان بیمار ہو گیا۔ سب لوگ دلآور بیگ کے پاس آ کر دوا مانگنے لگے۔ دلآور کوئی طبیب تو تھا نہیں۔ لیکن اس نے پانی میں یونہی تھوڑی سی راکھ ملا کر اور پھونک مار کر کہا۔ جاؤ یہ پانی مریض کو پلا دو۔ دلآور کی قسمت کچھ اچھی تھی، کہ وہ پٹھان تندرست ہو گیا۔ اب تو بہت سے پٹھان اس کے دوست بن گئے۔ ہاں کچھ لوگ اب بھی اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

گل زمان، دلآور کے سخت خلاف تھا۔ وہ جب اسے دیکھتا، منہ پھیر لیتا۔ پہاڑی کے نیچے ایک اور بوڑھا رہتا تھا۔ مسجد کی طرف جاتے ہوئے دلآور اسے دیکھا کرتا تھا۔ یہ بوڑھا پستہ قامت تھا۔ ریش و بروت برف کے مانند سفید۔ چہرہ سرخ اور اس پر جھریاں پڑی ہوئیں۔ ناک نوکیلی اور آنکھیں خونخوار۔ دو داڑھوں کے سوا سب دانت غائب!! وُہ لکڑی ٹیکتا چاروں طرف بھیڑیے کی طرح جھانکتا ہوا نماز کے وقت جب کبھی دلآور کو دیکھ لیتا تو جل کر راکھ ہو جاتا اور منہ پھیر لیتا۔

ایک دن دلآور بوڑھے کا مکان دیکھنے کے لیے پہاڑی سے نیچے اُترا کچھ دُور جانے پر اسے ایک باغیچہ ملا۔ اس کے چاروں طرف پتھروں سے حد بندی کی گئی تھی۔ درمیان میں کچھ میوہ دار درخت تھے۔ ان درختوں کے درمیان ایک جھونپڑا تھا۔ دلآور آگے بڑھ کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی بٹری اُلجھ کر آواز پیدا ہوئی۔ بوڑھا چونکا۔ کمر سے پستول نکال کر اس نے دلآور پر گولی چلائی۔ لیکن وہ دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ تھوڑی

دیر بعد دلاور نے بوڑھے کو علی شیر کے پاس آکر بڑبڑاتے ہوئے سُنا۔
علی شیر نے دلاور کو بلا کر پوچھا۔ "تم بوڑھے کے گھر کیوں گئے تھے؟"

دلاور نے کہا۔ "میں نے اس کا کچھ بگاڑا تو نہیں۔ میں تو صرف یہ دیکھنے گیا تھا کہ بوڑھا رہتا کہاں ہے۔"

علی شیر نے بوڑھے کو بہت سمجھایا کہ کوئی بات نہیں۔ لیکن بوڑھا بڑبڑاتا ہی رہا۔ دلاور بیگ اس کے لہجے سے صرف یہ سمجھ سکا کہ وہ کہہ رہا ہے۔ ان کا گاؤں میں رہنا مناسب نہیں۔ انہیں قتل کر دینا چاہیئے۔ بوڑھے کے چلے جانے کے بعد اس نے علی شیر سے پوچھا۔ "یہ بوڑھا کون ہے؟"

"یہ بہت بڑا آدمی ہے۔ انگریزی فوج سے کئی بار ٹکر لے چکا ہے۔ اس نے کئی سپاہی قتل کیے ہیں۔ پہلے یہ بڑا دولت مند تھا۔ اس کی تین عورتیں اور آٹھ بیٹے تھے۔ سب ایک جگہ رہتے تھے۔ اس کے سات بیٹے تو پہلی جنگ میں مارے گئے۔ آٹھواں قید ہو گیا اور بے چارہ قید ہی میں مر گیا۔ یہ دل شکستہ ہو کر حج کو چلا گیا۔ اب وہاں سے آکر اس پہاڑی کے پیچھے رہتا ہے۔ یہ ہندوستانی فوج کا سخت مخالف ہے۔ ابھی ابھی کہہ رہا تھا کہ انہیں قتل کر ڈالنا چاہیئے۔ لیکن میں یہ کیسے کر سکتا ہوں۔ پھر روپیہ کہاں سے ملے گا۔ اس کے سوا تو میں تمہیں یہاں سے جانے بھی نہیں دوں گا۔"

اسی طرح دلاور کو یہاں ایک مہینہ آدھ گزر گیا۔ دن کے وقت وہ ادھر

اُدھر بکھیرتا رہتا۔ اور رات کو دیوار میں سوراخ کرتا رہتا۔ پتھر کی دیوار کو کھودنا
آسان کام نہ تھا۔ لیکن وہ ریتی کی مدد سے پتھروں کو کاٹتا رہتا۔ یہاں تک کہ
آخر اس نے اپنے نکلنے کے لئے راستہ بنا لیا۔ اب اسے صرف یہ فکر تھی کہ
بھاگنے کا راستہ معلوم کیا جا سکے۔

ایک دن علی شیر باہر گیا ہوا تھا۔ ولاور کھانا کھانے کے بعد شیر کے
پہرے کی فکر چھوڑ کر راستہ معلوم کرنے کے ارادے سے پہاڑی کی طرف چل دیا۔
علی شیر باہر جاتے وقت اپنے چھوٹے لڑکے سے کہہ جایا کرتا تھا کہ ولاور کو
آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ اس لئے بچہ اس کے پیچھے دوڑا اور چلا کر
کہنے لگا "مت جاؤ۔ میرے باپ کا حکم ہے۔ اگر تم واپس نہیں لوٹو گے تو
میں ابھی گاؤں والوں کو بلا لوں گا۔"

ولاور بچے کو پھسلانے لگا "میں دور نہیں جاتا۔ صرف اس پہاڑی
تک جانا چاہتا ہوں۔ بچوں کے لئے مجھے ایک بوٹی کی تلاش ہے۔ تم تو
پیروں میں بیڑی کے ساتھ بھلا کہیں بھاگ سکتا ہوں؟ آؤ ـــــ کل میں تمہیں
تیر کمان بنا دوں گا۔"

تیر کمان کے لالچ سے بچہ رضامند ہو گیا۔ پہاڑی کی چوٹی کچھ زیادہ دور
نہ تھی۔ بیڑی کے باعث چلنا دشوار تھا۔ لیکن جوں توں کر کے ولاور چوٹی پر
پہنچ گیا۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جنوبی سمت ایک گھاٹی دکھائی دی۔ اس میں
گھوڑے چر رہے تھے۔ گھاٹی کے نیچے ایک بستی تھی۔ اس سے پرے ایک
بلند پہاڑی تھی اور آگے پھر ایک اور پہاڑی۔ ان پہاڑیوں کے درمیان

جنگل تھا۔ اس سے پرے پھر پہاڑ تھے ۔۔۔ ایک سے ایک بلند ۔۔۔ مشرق و مغرب میں بھی ایسی ہی پہاڑیاں تھیں۔ شمال کی طرف ایک ندی تھی۔ اور وہ گاؤں جس میں وہ رہتا تھا اس سے پرے بلند و بالا پہاڑیوں کا سلسلہ دراز! اس نے مشرق کی سمت نگاہ دوڑائی۔ تو دیکھا کہ دور دو پہاڑیوں کے پرے جنگل کے پار میدان سا ہے۔ میدان سے بہت دور دھواں سا دکھائی دیا۔ دلاور نے اندازہ کر لیا کہ مجھے اسی سمت جانا ہے۔

چاروں طرف تاریکی پھیل گئی۔ مغرب کی اذان فضا میں گونج اٹھی۔ مویشی گھروں کو لوٹ آئے۔ دلاور بھی اپنی کوٹھڑی میں آگیا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں اور رات بالکل تاریک۔ اس نے اسی رات بھاگنے کا عزم کر لیا۔ لیکن بدقسمتی سے پٹھان واپس لوٹ آئے۔ ان کے ساتھ ایک لاش بھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کوئی پٹھان لڑتے لڑتے مارا گیا ہے۔

تجہیز و تکفین کے بعد وہ اسے قبرستان میں دفنا آئے۔ تیسرے دن قل کرنے کے بعد وہ پھر باہر چلے گئے۔ علی شیر گھر ہی رہا۔ دلاور نے سوچا آج رات بھاگنا ٹھیک ہے۔ غلام قادر سے کہنے لگا۔ " بھائی سرنگ تیار ہے۔ چلو بھاگ چلیں۔"

غلام قادر نے خوفزدہ ہو کر کہا " راستہ تو جانتے ہی نہیں۔ بھاگیں گے کیسے ۔۔۔؟"

" میں راستہ جانتا ہوں تم فکر نہ کرو!"

" مانا کہ تم راستہ جانتے ہو۔ لیکن ایک رات میں ہم قبائلی علاقہ

کو پار نہ کر سکیں گے۔"

"اگر گھر تک نہ پہنچ سکیں گے تو راستہ میں کسی جنگل میں چھپ کر دن کاٹ لیں گے۔ دیکھو میں نے کھانے کا انتظام بھی کر لیا ہے۔ یہاں پڑے پڑے سڑنے سے کیا فائدہ؟ اگر گھر سے رد بھی نہ آیا تو کیا بنے گا؟ ابھی ابھی ان کا ایک آدمی مارا گیا ہے۔ اس لیئے یہ سب غضبناک ہو رہے ہیں۔ بھاگنا ہی مناسب ہے ورنہ خدا جانے کیا گل کھلے!"

یہ سنکر غلام قادر بھی رضامند ہو گیا۔

(۴)

جب گاؤں میں سناٹا چھا گیا تو دلاور سرنگ سے باہر نکلا۔ لیکن غلام قادر کے پاؤں سے ایک پتھر گر پڑا۔ اس کی آواز سن کر علی تنبیر کا کتا بھونکا۔ لیکن دلاور نے اسے پہلے ہی مانوس کر لیا تھا۔ دلاور کی آواز سنکر وہ خاموش ہو گیا

رات تاریک تھی ـــ شیطان کے دل سے بھی زیادہ سیاہ اور بھیانک! چاروں طرف سناٹا تھا۔ گھاٹیاں ہلکی دھند کا غلاف اوڑھے ہوئے تھیں۔ لیکن آسمان پر ستارے تلاش راہ میں مصروف نظر آتے تھے۔ چلتے چلتے راستے میں چھت پر سے کسی بوڑھے کے وظیفے کی آواز سنائی دی۔ دونوں ٹھٹک گئے۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی طاری ہو گئی۔ تو وہ آگے بڑھے

دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دلاور ستاروں کی طرف دیکھتا راستہ چل رہا تھا۔ فضا خوشگوار تھی۔ اس لئے چلنا ذرا آسان تھا۔ دلاور کودتا، پھاندتا چلا جاتا تھا۔ لیکن غلام قادر پیچھے رہنے لگا۔ اس نے دلاور سے

کہا:-

"بھائی دلاور! ذرا ٹھہرو! جوتوں نے میرے پاؤں میں آبلے ڈال دیئے ہیں ___!"

"جوتے اُتار کر پھینک دو۔ ننگے پاؤں چلو" دلاور نے کہا۔

غلام قادر نے جوتے اُتار کر پھینک دیئے۔ لیکن اب پتھروں سے پاؤں زخمی ہو گئے اور وہ ٹھہر ٹھہر کر چلنے لگا۔

دلاور نے کہا " دیکھو بھیا! پاؤں تو پھر بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ اگر پٹھانوں نے آ پکڑا تو سمجھو کہ جان گئی"

غلام قادر خاموشی سے اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دُور چل کر دلاور بولا "اُف! ہم راستہ بھول گئے۔ ہمیں تو بائیں طرف کی چوٹی پر چڑھنا چاہیئے تھا"

غلام قادر نے کہا" ذرا ٹھہرو! دم لے لینے دو۔ میرے پاؤں زخمی ہو گئے ہیں۔ دیکھو خون بہہ رہا ہے"

"کچھ فکر نہ کرو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم چلے آؤ!"

وہ لوٹ کر بائیں ہاتھ کی پہاڑی پر چڑھ گئے۔ جھاڑیوں میں اُلجھ اُلجھ کر اُن کے کپڑے تار تار ہو گئے۔ اتنے میں کچھ آہٹ ہوئی۔ دونوں ڈر گئے۔ نزدیک جانے پر معلوم ہوا کہ کوئی جنگلی جانور بھاگا جا رہا ہے۔

صبح ہونے لگی۔ منزلِ مقصود ابھی یہاں سے سات میل دُور تھی۔ غلام قادر جی ہار کر بیٹھ گیا اور بولا:-

"میرے پاؤں تو اب دے رہے ہیں۔ اب میں نہیں چل سکتا۔"
دلاور غصے سے بولا۔" اچھا تو سلام علیکم! میں تو جاتا ہوں!"
غلام قادر اٹھ کر ساتھ ہو لیا۔ تین میل بڑھے تھے کہ گھوڑوں کی ٹاپ
سنائی دی۔ وہ بھاگ کر جنگل میں چھپ گئے۔ دلاور نے دیکھا کہ ایک پٹھان
گھوڑے پر سوار جا رہا ہے۔ جب وہ نکل گیا۔ تو دونوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور
دلاور بولا " چلو اب چلیں!"
لیکن غلام قادر نے کہا " مجھ میں تو اب چلنے کی طاقت نہیں!"
وہ موٹا تازہ آدمی تھا۔ اس کے پاؤں زخموں سے چھلنی اور سردی سے
شل ہو گئے تھے۔ دلاور اسے کندھے پر اٹھانے لگا تو وہ درد سے بلبلا اٹھا
دلاور نے کہا " ہاں، ہائے کیا کرتے ہو۔ پٹھان قریب ہی جا رہا ہے کہیں سن
نہ لے۔ اچھا اگر تم چل نہیں سکتے تو میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ!"
دلاور اسے پیٹھ پر لاد کر چلنے لگا۔

(۵)

اب ادھر کی بات سنیئے۔ پٹھان نے ان کی آواز سن لی۔ اس نے تھما
میں گولی چلائی اور اپنے ساتھیوں کو بلانے کے لئے گھوڑا دوڑا دیا۔
دلاور نے کہا " قادر! معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ہماری آواز سن لی ہے
اور اب وہ ساتھیوں کو بلانے گیا ہے۔ اگر ہم ان کے آنے سے پیشتر دور
نکل گئے تو زندگی محال ہے!"
غلام قادر نے کہا " تم اکیلے چلے جاؤ۔ میری وجہ سے تم کیوں جان خطر

ہیں ڈالتے ہو۔"

دلاور نے جواب دیا"یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ تمہیں یوں چھوڑ کر چلے جانا سخت بزدلی ہے، یہ اسلامی تعلیم اور انسانی اخلاق کے سراسر منافی ہے"۔

——اور وہ اسے کندھے پر لاد کر چلنے لگا۔ آدھ میل چلنے پر ایک چشمہ ملا۔ دلاور بہت تھک گیا تھا۔ وہ غلام قادر کو اُتار کر دم لینے لگا۔ ابھی وہ پانی پینے ہی لگا تھا کہ پیچھے سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ دونوں بھاگ کر جھاڑیوں میں چھپ گئے۔

پٹھان عین وہیں آ کر ٹھہرے۔ جہاں دونوں چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے کتے کو تلاش میں چھوڑ دیا۔ کتا سونگھتا ہوا وہاں جا پہنچا اور دونوں گرفتار ہو گئے۔ پٹھانوں نے دونوں کو باندھ کر گھوڑوں پر لاد لیا۔ راستے میں علی شیر مل گیا۔ اس نے اپنے قیدیوں کو پہچانا۔ اور دن نکلتے نکلتے وہ پھر گاؤں میں جا پہنچے۔

اتنے میں بوڑھا بھی وہاں آ گیا۔ سب پٹھان مل کر غور کرنے لگے کہ کیا کرنا چاہیئے؟ بوڑھے نے کہا"غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ فوراً دونوں کو قتل کر دو۔ یہ فوجی بڑے بدمعاش ہوتے ہیں"

علی شیر نے کہا۔"میں نے تو ان پر روپیہ خرچ کیا ہے، قتل کیسے کر ڈالوں؟"
بوڑھے نے کہا۔"ان فوجیوں کو کھلانا پلانا سخت گناہ ہے۔ ان سے تکلیف اور پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔ قتل کر کے جھگڑا چکاؤ۔"
سب پٹھان ادھر ادھر چلے گئے۔ علی شیر نے دلاور کے پاس آ کر کہا:-

"دیکھو، دلاور! اگر پندرہ دن کے اندر اندر روپیہ نہ آیا اور تم نے پھر یہاں سے بھاگنے کی جرأت کی تو ہیں نہیں لازماً قتل کر ڈالوں گا۔ اب فوراً گھر والوں کو تاکیدی خط لکھ دو کہ روپیہ بہت جلد بھیج دیں۔

دونوں نے خط لکھ دیئے اور وہ پھر پہلے کی طرح قید کر دیئے گئے۔ لیکن کوٹھڑی میں نہیں بلکہ اب ایک چھ ہاتھ چوڑے گڑھے میں بند کئے گئے۔

(۶)

اب انھیں سخت اذیت دی جانے لگی۔ نہ باہر جا سکتے تھے نہ بیڑیاں نکالی جاتی تھیں۔ کتوں کی طرح ادھ پکی روٹیاں اور پانی کا لوٹا دیا جاتا تھا اور یہ نہیں گڑھا نم آلود، تاریک اور بدبودار تھا۔ غلام قادر کا تمام جسم متورم ہو گیا۔ دلاور بھی افسردہ و غمگین رہنے لگا۔ کہ کرے تو کیا کرے — کس طرح اس مصیبت سے رہائی ملے۔

ایک دن دلاور بے حد غمگین بیٹھا تھا کہ اوپر سے روٹی گری۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ستارہ بیٹھی تھی۔

دلاور نے سوچا۔ کیا ستارہ اس کام میں میری کچھ مدد کر سکتی ہے؟ — ہاں، اس کے لئے کوئی کھلونا بنانا چاہیئے۔ کل آئے گی تو وہ اسے دے کر پھر بات کروں گا۔

لیکن دوسرے دن ستارہ نہیں آئی۔ کئی آدمی گھوڑوں پر سوار ادھر سے نکل گئے۔ وہ بلند آواز میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ دلاور بیگ [illegible] تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ البتہ اس نے یہ اندازہ لگایا کہ ہندوستانی فوج کے بارے

میں باتیں کر رہے تھے ـــــ اور اس نے سوچا کہ شاید ہندوستانی فوج کہیں نزدیک آ پہنچی ہے۔

تیسرے دن ستارہ پھر آئی اور وہ دو نہاں گڑھے میں پھینک دیں ڈالا اور سے پوچھا۔ "تم کل کیوں نہیں آئیں؟ میں نے تمہارے لیئے کھلونے بنائے ہیں!"

ستارہ نے کہا "کھلونے لے کر کیا کروں گی؟ مجھے کھلونے نہیں چاہئیں انہوں نے کل تمہیں مار ڈالنے کا پختہ فیصلہ کر لیا ہے۔ سب آدمی جمع ہوئے تھے۔ اسلیئے میں نہیں آسکی۔"

"کون مارنا چاہتا ہے؟"

"میرا باپ! کل بوڑھے نے یہ مشورہ دیا ہے کہ ہندوستانی فوج نزدیک آ پہنچی ہے۔ اسلیئے تمہیں مار ڈالنا ہی مناسب ہے۔ مجھے تو یہ سنکر رونا آتا ہے۔"

"اگر تمہیں مجھ پر رحم آتا ہے تو مجھے ایک بانس لا دو ـــ!"

"نہ بابا، یہ مجھ سے نہ ہوگا۔"

"ستارہ! دیکھو، ہم پر رحم کر" پکچھ نرس کہا۔ "میں ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں۔ بڑی نیک اور رحمدل ہے تو تو۔"

"لیکن بانس لاؤں کس طرح؟ وہ سب گھر پر بیٹھے ہیں ـــ دیکھ لیں گے تو ......؟"

یہ کہکر وہ چلی گئی۔

سورج غروب ہو گیا۔ آسمان پر ستارے آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ دلاور خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ ستارہ بانس لائیگی یا نہیں؟

اچانک اوپر سے مٹی گرنے لگی۔ دیکھا تو سامنے بانس لٹک رہا تھا۔ دلاور بڑا خوش ہوا اور اس نے بانس نیچے کھینچ لیا۔

باہر آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ گڑھے کے کنارے پر منہ رکھ کر ستارہ نے کہا ——" دلاور! دو کے سوا باقی سب باہر چلے گئے ہیں"۔

دلاور نے غلام قادر سے کہا" قادر بھائی! آؤ ایک بار پھر کوشش کریں۔ ہمت نہ ہارو۔ چلو، میں تمہاری مدد کروں گا"

" مجھ میں تو کروٹ لینے کی بھی طاقت نہیں، چلنا تو در کنار۔ میں نہیں بھاگ سکتا۔" غلام قادر نے کراہتے ہوئے کہا۔

دلاور نے کہا" اچھا تو الوداع! لیکن مجھے بے رحم نہ سمجھنا"

وہ غلام قادر سے گلے ملا۔ بانس کا ایک سرا ستارہ نے پکڑا اور وہ اس کی مدد سے باہر نکلا۔

" ستارہ! میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ تم رحم اور محبت کی مورتی ہو۔ میں عمر بھر تمہیں نہیں بھول سکتا۔ دیکھنا کہیں تم نہ بھول جانا"

ستارہ کی آنکھوں میں محبت کے شفاف موتی چمکنے لگے ——انمول موتی! اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی" تم شاید بھول جاؤ، مرد جو ٹھہرے لیکن میں —— " وہ بات کو مکمل نہ کہہ سکی۔ اور منہ پھیر کر بھاگ

لئی۔

دلاور نے تھوڑی دُور جا کر پتھروں سے بیڑی توڑنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر وہ اسے ہاتھ میں اُٹھا کر چلنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ چاند نکلنے سے پیشتر جنگل میں پہنچ جائے۔ ابھی تھوڑی ہی دُور گیا ہو گا۔ کہ عقب سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ وہ چھپنا ہی چاہتا تھا کہ گھوڑا سر پر آ پہنچا۔ ستارہ نے گھوڑے سے اتر کر ریتی سے اس کی بیڑی کاٹی۔ اور گھوڑا اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا "جاؤ! خدا تمہارا نگہبان ہو!"

اب چاند نکل آیا تھا اور اس کی سنہری شعاعیں ستارہ کے حسین چہرے پر بکھر رہی تھیں۔ دلاور نے دیکھا۔ ستارہ کے چہرے پر ایک اطمینان آمیز غم طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے ہیں۔ جوشِ جذبات سے اس نے ستارہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا ——— "ستارہ!"

اور دوسرے ہی لمحے ستارہ کا سر دلاور کے کندھے پر جھک گیا۔

دلاور نے موقعہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔ "ستارہ! کیا تم میرا ساتھ دے سکو گی؟"

ستارہ نے نیم رضا مندانہ آنکھوں سے دلاور کی طرف دیکھا۔ دلاور نے پھر اس کی طرف دیکھا ——— "تو پھر ہمیں دیر نہ کرنی چاہیئے۔ کہیں تمہارے رشتہ دار تعاقب میں نہ آ پہنچیں۔"

اور وہ دونوں گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہوئے ———

چاند پھیکا پڑ گیا تھا۔ صبح ہونے والی تھی۔ جنگل بہت پیچھے رہ گیا

تھا ــــ اب صاف راستہ آ گیا تھا اور سامنے انگریزی فوج کی چوکی نظر آتی تھی۔ ستارہ ابھی تک خوف سے کانپ رہی تھی۔ دلاور نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ــــ "اب گھبرانے کی کیا بات ہے؟ اب تو ہم آ ہی پہنچے ہیں ــــ"

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ بائیں طرف دو سَو قدم کے فاصلے پر کچھ پٹھان گھوڑے دوڑائے آتے دکھائی دیئے۔ دلاور نے گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا اور زور سے چلّایا:۔

"دَوڑو، دَوڑو! بچاؤ، بچاؤ!!"

چوکی پر سپاہیوں نے اس کی آواز سُن لی۔ وُہ اس کی امداد کو لپکے پٹھان یہ دیکھ کر بھاگ نکلے۔ نزدیک آنے پر سپاہیوں نے اسے پہچانا اور بڑے تپاک سے مل کر اس کا حال پوچھا ــــ دلاور نے سب داستان بیان کی اَور پھر افسرانِ بالا سے مزید رخصت حاصل کر کے گھر گیا۔ اس کی ماں بیٹے کو دیکھ کر دوبارہ زندہ ہو اٹھی اور دلاور نے ستارہ سے شادی کر کے ماں کی آخری آرزو بھی پوری کر دی۔

قریباً ایک مہینہ بعد پانچ ہزار روپے ادا کر کے غلام قادر بھی رہا ہو کر آ گیا۔ وہ اس وقت نیم مُردہ سا ہو رہا تھا۔

محبّت خدا ہے

بلنتی چمار ایک غریب عیسائی تھا۔ بیچارے کے پاس نہ گھر تھا نہ زمین وہ اپنے بیوی بچوں سمیت ایک جھونپڑی میں رہتا تھا اور محنت مزدوری سے پیٹ پالتا تھا۔ مزدوری کم تھی اور اناج بے حد گراں۔ جو کچھ کماتا تھا، وہ کھانے پینے پر صرف ہوجاتا تھا۔ سردیوں میں تمام خاندان ایک ہی کمبل اوڑھ کر سویا کرتا تھا اور وہ کمبل بھی کہنہ و بوسیدہ ہو کر تار تار ہو رہا تھا۔ گذشتہ ایک سال سے وہ اس فکر میں تھا کہ کہیں سے اور کمبل لے آئے۔ پیٹ کاٹ کر اس نے تین روپے جمع کئے تھے۔ اور پانچ روپے قریبی گاؤں سے واجب الوصول تھے۔

ایک دن اس نے سوچا کہ گاؤں سے پانچ روپے وصول کرکے کوئی کپڑا لے آؤں۔ چنانچہ وہ اس گاؤں میں پہنچا اور سب سے پہلے ایک کسان کے گھر گیا۔ کسان تو گھر پر نہیں تھا۔ اس کی عورت نے کہا۔ کہ اس وقت تو روپیہ موجود نہیں، پھر کبھی دقت دینگے۔ پھر وہ دوسرے کسان کے ہاں پہنچا۔ وہاں سے بھی وہی جواب ملا۔ ناچار اس نے بنیئے کی دُکان پر پہنچ کر ادھار کپڑا مانگا۔ بنیئے نے جواب دیا:۔

"ہم ایسے کنگالوں کو اُدھار نہیں دیتے۔ کون پیچھے مارا مارا پھرے، جاؤ اپنی راہ لو!"

مایوس ہو کر بیچارہ گھر کی طرف لوٹا۔ راستے میں سوچنے لگا۔ "کتنے تعجب کی بات ہے کہ میں دن بھر کام کرتا ہوں۔ پھر بھی پیٹ نہیں بھرتا۔ چلتے وقت بیوی نے کہا تھا کہ کپڑا ضرور لانا۔ اب کیا کیا جائے؟ کوئی اُدھار بھی تو نہیں دیتا۔ کسانوں نے ٹکا سا جواب دیدیا کہ ابھی ہاتھ خالی ہے، پھر لے جانا ——— تمہارا تو ہاتھ خالی ہے اور یہاں جان کے لالے پڑے ہیں ——— تمہارے پاس گھر، مال، مویشی سب کچھ ہے۔ ہمارے پاس تو یہ جسم ہی جسم ہے۔ تمہارے پاس اناج کے کوٹھے بھرے ہیں اور مجھے ایک ایک دانہ قیمت ادا کر کے لانا پڑتا ہے۔ تین روپے تو سات دن کے کھانے ہی میں اُڑ جاتے ہیں ——— آہ، خدایا! کیا کروں، کہاں جاؤں؟"

یہ سوچتا ہوا وہ گاؤں سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ سرِراہ ایک سفید سی چیز پڑی ہے۔ اندھیرا کافی ہو چکا تھا۔ صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ پہلے تو اس نے خیال کیا کہ بیل ہوگا۔ لیکن نزدیک جانے پر معلوم ہوا کہ ایک انسان بالکل ننگا پڑا ہے۔ سیمن نے سمجھا کہ کسی نے اس کے کپڑے چھین لئے ہیں۔ مجھے کیا مطلب؟ ایسا نہ ہو اس جھگڑے میں ٹانگ اڑانے سے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔

یہ سوچ کر وہ آگے چل دیا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس کے دل نے کہا ——— میں کتنا سنگدل ہوں۔ کہیں وہ بیچارہ بھوکوں نہ مر رہا ہو۔

کتنی شرم کی بات ہے کہ میں اُسے اس حالت میں چھوڑ کر چلا جا رہا ہوں۔
—— وہ واپس پھرا اور اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

(۲)

نزدیک جا کر بنسی نے دیکھا کہ اچھا خاصہ جوان آدمی ہے، صرف سردی سے نیم جان ہو رہا ہے۔ اس کا بنسی کو آنکھ بھر کر دیکھنا تھا کہ بنسی کو اس پر رحم آگیا۔ اپنا کوٹ اتار کر بولا :- "یہ وقت باتیں کرنے کا نہیں —— یہ کوٹ پہن لو اور میرے ساتھ چلو!"

اس آدمی کا جسم تنومند، چہرہ حسین اور ترحم طلب اور ہاتھ پاؤں سڈول تھے۔ بنسی نے اُسے کوٹ پہنا کر کہا :- "اب چلو دوست! باتیں پھر ہوتی رہیں گی!"

اجنبی نے محبت آمیز نگاہوں سے بنسی کو دیکھا۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔

بنسی نے کہا۔ "تم بولتے کیوں نہیں؟ —— خیر، یہاں سردی بہت ہے گھر چلو۔ اگر تم چل نہیں سکتے تو یہ لو لکڑی، اس کے سہارے چلو!"

اجنبی بنسی کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

"تم کہاں رہتے ہو؟" بنسی نے پھر پوچھا۔

"میں یہاں کا رہنے والا نہیں، پردیسی ہوں۔"

"میں نے بھی یہی خیال کیا تھا۔ کیونکہ یہاں تو میں سب کو جانتا ہوں —— تم یہاں کیونکر آگئے؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔"

"کیا تمہیں کسی نے صدمہ پہنچایا ہے؟"

"مجھے کسی نے دُکھ نہیں دیا ——— اپنے ہی افعال کا نتیجہ ہے۔ خدا نے مجھے سزا دی ہے۔"

"بیشک، بیشک! خدا سب کا مالک ہے۔ لیکن کھانے کو اناج اور رہنے کو گھر تو چاہیئے۔ تم اب کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"جہاں خدا لے جائے!"

بلنسی حیران رہ گیا۔ اجنبی کی گفتگو بڑی دلکش تھی۔ اس کی آواز میں بڑی کشش تھی۔ وہ کوئی ٹھگ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اپنا پتہ نہیں بتاتا تھا۔ بلنسی نے سوچا۔ ضرور اس پر کوئی سخت مصیبت نازل ہوئی ہے۔ اس کی حالت سے متاثر ہو کر بولا :- "دوست! گھر چل کر آرام کرو۔ پھر دیکھا جائے گا۔"

دونوں چل دیئے۔ راستے میں بلنسی نے سوچا کہ میں تو کپڑا لینے آیا تھا۔ اُلٹا اپنا کوٹ بھی دے بیٹھا۔ ایک ننگا انسان ساتھ ہے۔ کیا یہ سب باتیں دیکھ کر مادھوی خوش ہوگی؟ ——— لیکن خیر، فکر کس بات کی؟ ہمدردی تو انسان کا فرض ہے!!

(۳)

اُدھر بلنسی کی بیوی مادھوی اس دن جلدی جلدی لکڑیاں کاٹ کر پانی لائی۔ پھر کھانا تیار کیا۔ بچوں کو کھلایا، خود کھایا اور شوہر کے لئے علیحدہ

کھانا رکھ کر، کرتے میں پیوند لگاتی ہوئی سوچنے لگی ـــــ ایسا نہ ہو، بنیا میرے شوہر کو ٹھگ لے۔ وہ بڑا سیدھا سادہ ہے۔ چھل فریب جانتا نہیں، کسی سے جھگڑنا اسے آتا نہیں، ایک بچہ بھی اسے پھندے میں پھنسا سکتا ہے۔ آٹھ روپے بہت ہوتے ہیں۔ اتنے روپوں میں تو بڑے اچھے کپڑے مل سکتے ہیں۔ جاتے وقت اسے دیر ہو گئی تھی۔ تاہم اس وقت تک اسے آجانا چاہیئے تھا۔

اتنے میں آہٹ ہوئی۔ مادھوی اٹھ کر باہر آئی۔ دیکھا ـــــ بنسی ہے اور اس کے ساتھ ہی ننگے سر، ننگے پاؤں ایک اور آدمی ہے۔ بنسی کا کوٹ اس نے پہن رکھا ہے۔ بنسی کے ہاتھ میں کوئی گٹھڑی بھی نہیں اور وہ سر جھکائے کھڑا ہے۔

یہ دیکھ کر مادھوی کا دل یاس و غم سے لبریز ہو گیا۔ اس نے سمجھا کہ کوئی ٹھگ ہے، تیوری چڑھا کر کھڑی ہو گئی۔ اور دیکھنے لگی کہ وہ کیا کرتا ہے۔

بنسی نے کہا۔" اگر کھانا تیار ہو تو لے آؤ۔"

مادھوی جل کر راکھ ہو گئی۔ اور خاموش کھڑی رہی۔ بنسی تاڑ گیا کہ وہ اس وقت غصے میں ہے۔ اس نے آہستہ سے پوچھا" کھانا نہیں بنایا ہے؟"

مادھوی نے غصے میں کہا۔" ہاں بنایا ہے۔ لیکن تمہارے لئے نہیں تم تو کپڑے لینے گئے تھے۔ یہ کیا کہ اپنا کوٹ بھی کسی کو دے دیا؟ اس

ٹھگ کو کہاں سے لائے ؟ یہاں کوئی سدا برت تو نہیں لگا رکھا ؟"

" دیکھو مادھوی ! بغیر سوچے سمجھے کسی کو بُرا کہنا اچھا نہیں۔ پہلے پوچھ تو لو کہ یہ کیا .... ؟"

" پہلے یہ بتاؤ کہ روپے کہاں پھینکے ؟"

" یہ لو اپنے تین روپے ، گاؤں والوں نے کچھ نہیں دیا ۔"

" روپے لے کر بھی مادھوی اسی لہجے میں بولی " میرے پاس دنیا بھر کے بھوکے ننگے لفنگوں ، اوباشوں کے کھلانے پہنانے کو کچھ نہیں ۔"

" پھر وہی بات ؟ پہلے اس سے پوچھ تو لو کہ کہنا کیا ہے ؟"

" بس ، بس ، پوچھ چکی ! میں تو تم سے بیاہ ہی نہیں کرنا چاہتی تھی قسمت کھوٹی تھی کہ ماں باپ نے تمہارے پلّے باندھ دیا ۔"

بلنتی نے بہتیرا سمجھایا ، پر وہ ایک نہ مانی دس برس کے پرانے گڑے مُردے اکھاڑ کر جھگڑنے اور شور مچانے لگی ۔ یہاں تک کہ غصّے میں آکر اس نے بلنتی کی جاکٹ پھاڑ ڈالی اور گھر سے باہر جانے لگی ۔ لیکن پھر جاتے جاتے رُک کر بولی ۔ " یہ اگر شریف ہوتا تو یوں ننگ دھڑنگ نہ ہوتا ۔ بھلا تمہاری اس سے کہاں ملاقات ہوئی تھی ؟"

" یہی تو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا ـــــــ یہ گاؤں سے باہر ننگا بیٹھا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا ۔ ذرا خیال تو کرو ، یہ موسم باہر ننگا بیٹھنے کا ہے ۔ اتفاقاً میں وہاں جا پہنچا ۔ ورنہ نہ جانے کیا ہوتا ـــــــ بیچارہ زندہ رہتا یا سردی سے اکڑ کر رہ جاتا ۔ ہمیں کیا معلوم بیچارے پر کیا مصیبت آئی ہے ؟ میں اپنا

کوٹ پہنا کر یہاں لے آیا ہوں۔ دیکھو اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔ غصہ پاپ کی جڑ ہے۔ آخر ایک دن ہم سب کو مرنا ہے۔"

مادھوی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اجنبی کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے، گھٹنوں پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھا رہا۔

" اچھی خاتون! کیا تمہیں خدا اور اس کا بیٹا عزیز نہیں ؟" اجنبی نے کہا۔

یہ بات سن کر اور اجنبی کی طرف دیکھ کر مادھوی کا دل پگھل گیا۔ وہ فوراً جا کر کھانا لے آئی اور ان کے آگے رکھ کر بولی "کھائیے!"

یہ دیکھ کر اجنبی کا چہرہ چمکنے لگا۔ اور وہ مسکرایا!

کھانے کے بعد مادھوی نے پوچھا "تم کہاں سے آئے ہو؟"

" بہت دور سے!"

" تم اس گاؤں میں کیونکر پہنچ گئے ؟"

" میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

" کیا کسی نے تمہارا مال چرا لیا ہے؟"

" نہیں، کسی نے میری کوئی چیز نہیں چرائی۔ صرف خدا نے سزا دی ہے۔"

" کیا تم وہاں ننگے بیٹھے تھے ؟"

" ہاں! میں سردی کے مارے ٹھٹھر رہا تھا۔ تمہارے شوہر نے دیکھ کر مجھ پر رحم کھایا اور مجھے اپنا کوٹ پہنا کر یہاں لے آیا۔ تم نے ترس کھا کر کھانا کھلا دیا۔ خدا تم دونوں کا بھلا کرے۔"

مادھوی نے ایک پرانی قمیص اور دے دی۔ رات جب وہ اپنے شوہر کے پاس جا کر لیٹی تو بولی :۔

" اناج تو ختم ہو گیا۔ کل کھانا کہاں سے آئے گا ؟ شاید ہمسائی سے مانگنا پڑے ۔"

" جب اس نے پیدا کیا ہے تو کہیں سے اناج بھی دے گا ۔" بلنسی نے کہا۔

" وہ آدمی معلوم تو شریف ہوتا ہے۔ لیکن اپنا پتہ کیوں نہیں بتاتا ؟"

" کیا معلوم ؟ کوئی وجہ ہو گی !"

" ہم اوروں کو دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں کوئی نہیں دیتا !" مادھوی نے حیرت سے کہا۔

بلنسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور منہ پھیر کر سو گیا۔

(۴)

صبح بلنسی کی آنکھ کھلی تو بچے ابھی سو رہے تھے۔ بیوی ہمسائی سے اناج مانگنے گئی تھی اور اجنبی زمین پر بیٹھا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ اب مسرور تھا۔

بلنسی نے کہا۔" دوست ! پیٹ روٹی مانگتا ہے اور جسم کپڑے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ کام کرنا ضروری ہے۔ تم کوئی کام جانتے ہو ؟"

" میں تو کوئی بھی کام نہیں جانتا !"

" تجربہ سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ انسان چاہے تو سب کچھ سیکھ سکتا ہے۔"

"ہاں، ہاں، میں ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔ آپ سکھا دیجئے!"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"مِیکوُ!"

"اچھا تو مِیکوُ بھائی! اگر تم اپنا حال سنانا نہیں چاہتے تو نہ سناؤ! تم بڑی خوشی سے یہاں رہ سکتے ہو۔ میں تمہیں جوتے بنانے سکھا دوں گا۔"

چنانچہ بسنتی نے مِیکوُ کو سوت بانٹنا، اس پر موم چڑھانا اور جُوتے سینا وغیرہ سکھانا شروع کر دیا۔ تین چار ہی دن میں مِیکوُ ایسے جُوتے بنانے لگا، جیسے بچپن ہی سے موچی کا کام کرتا رہا ہو۔ وہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ بولتا بھی بہت کم تھا۔ ابھی تک وہ صرف ایک بار ہنسا تھا اور وہ بھی اس وقت جب پہلے دن مادھوی نے اسے کھانا کھلایا تھا۔ پھر کسی نے اسے ہنستے نہیں دیکھا۔

(۵)

آہستہ آہستہ ایک برس گزر گیا۔ چاروں طرف دھوم مچ گئی کہ جیسے اچھے اور مضبوط جُوتے، بسنتی کا نوکر مِیکوُ بناتا ہے اور کوئی نہیں بنا سکتا۔ بسنتی کے پاس اتنا کام آنے لگا کہ سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی۔ آمدنی کا کوئی حساب ہی نہ رہا۔

ایک دن بسنتی اور مِیکوُ بیٹھے کام کر رہے تھے کہ مکان کے سامنے ایک گاڑی آ کر رُکی۔ اور اس میں سے ایک رئیس اُتر کر ان کے پاس آیا۔ بسنتی نے

اٹھ کر سلام کیا۔ اس نے عمر بھر میں ایسا خوبصورت اور وجیہہ آدمی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ خود دُبلا پتلا تھا، اور مینکو اس سے بھی دُبلا اور نازک ـــــــ مادھوی تو ہڈیوں کا پنجر تھی۔ یہ نو وارد کسی دوسری ہی دُنیا کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا۔ سُرخ چہرہ، فراخ سینہ، تنی ہوئی گردن۔ جیسے تمام جسم لوہے میں ڈھلا ہوا ہو۔

" اُس نے آتے ہی پوچھا" اُستاد کون ہے؟"

" مَیں ہوں حضور!" بلنتی نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

نو وارد نے چمڑہ دکھاتے ہوئے کہا" یہ چمڑہ دیکھتے ہو!"

" جی حضور!"

" جانتے ہو، یہ کس قسم کا چمڑہ ہے؟"

" مہاراج! بہت بڑھیا ہے۔"

" بڑھیا کے بچے، کبھی دیکھا ہے ایسا چمڑہ؟ یہ جرمنی کا چمڑہ ہے اور اس کی قیمت بیس روپے ہے۔"

" بھلا مہاراج! ایسا چمڑہ میں کہاں سے دیکھ سکتا تھا؟"

" اچھا! تم اس کا بوٹ بنا سکتے ہو؟"

" ہاں سرکار! بنا سکتا ہوں۔"

ہاں سرکار کی بات نہیں، یہ سمجھ لو کہ چمڑہ کیسا ہے۔ اور بنوانے والا کون ہے۔ اگر سال بھر کے اندر کوئی ٹانکا اُکھڑ گیا یا جوتے کی شکل بگڑ گئی تو تجھے جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔ ورنہ دس روپے انعام ملے گا۔"

بنسی نے کنکھیوں سے مینکو کی طرف دیکھ کر ہنسنے سے پوچھا کہ کام لے لوں ؟

اُس کے اثبات میں سر ہلانے پر بنسی ناپ لینے لگا۔

نوواردنے پھر کہا۔" دیکھو ناپ ٹھیک لینا۔ بوٹ چھوٹا نہ ہو (پھر مینکو کی طرف دیکھ کر) یہ کون ہے ؟"

" میرا کاریگر!"

" نوواردنے مینکو کی طرف دیکھکر کہا۔" دیکھو، بوٹ ایک سال چلنا چاہیئے۔ پورا ایک سال، کم نہیں!"

مینکو کا اس کی طرف دھیان ہی نہ تھا۔ وہ کسی اَور ہی دھن میں مست بیٹھا ہنس رہا تھا۔

نوواردنے غصّے سے کہا۔" بیوقوف بات سنتا ہے کہ ہنستا ہے؟ دیکھو بوٹ بہت جلد تیار کرنا۔ دیر نہ ہو!"

باہر نکلتے وقت اس کی پیشانی دروازے سے ٹکرا گئی۔ بنسی بولا :-

" سر تھا کہ فولاد! دروازہ ہی توڑ ڈالا تھا۔

مادھوی بولی۔" امیر بڑے طاقتور ہوتے ہیں۔ اس آدمی کو فرشتۂ اجل بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا" اوروں کی تو بات ہی الگ رہی۔"

بنسی نے مینکو سے کہا۔" دیکھو بھائی! کام تو لے لیا ہے۔ لیکن کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہو جائے۔ چمڑہ بہت قیمتی ہے اور یہ آدمی بہت کڑوا معلوم ہوتا ہے ذرا بھی بھول نہ ہونی چاہیئے۔ تمہارا ہاتھ صاف ہو گیا ہے۔ بوٹ کاٹ

تم دو، سی میں دُونگا۔"

میکو بوٹ کاٹنے لگا۔ مادھوی روز اپنے شوہر کو بوٹ کاٹتے دیکھا کرتی تھی۔ میکو کی کاٹ دیکھکر جکبرائی کہ یہ کیا کر رہا ہے؛ پھر یہ سوچ کر کہ شاید بڑے آدمیوں کے بوٹ اسی طرح کاٹے جاتے ہوں' وہ خاموش رہ گئی۔

میکو نے چمڑہ کاٹ کر دوپہر تک سلیپر تیار کر لئے۔ بنسی جب کھانا کھاکر بیٹھا تو کیا دیکھتا ہے کہ بوٹ کی بجائے سلیپر بنے رکھے ہیں۔ وہ گھبرا گیا۔ اور دل میں کہنے لگا ـــــ اس میکو کو میرے پاس رہتے ایک سال ہوگیا ہے ایسی غلطی تو اس نے کبھی نہیں کی۔ یہ آج اسے کیا ہو گیا؟ اس آدمی نے تو بوٹ بنانے کو کہا تھا اور اس نے سلیپر بنا دیئے۔ اب اسے کیا جواب دوں گا ایسا چمڑہ بھی یہاں نہیں مل سکتا۔ اس نے میکو سے پوچھا۔"دوست یہ تم نے کیا کیا؟ اس نے تو بوٹ بنانے کو کہا تھا اب میرے سر کے بال سلامت نہ رہیں گے۔"

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ باہر سے ایک آدمی نے آواز دی۔ مادھوی نے دروازہ کھول دیا۔ اس رئیس کا نوکر تھا، جو پہلے اس کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے آتے ہی سلام کرنے کے بعد کہا:۔

"تم نے ابھی تک بوٹ بنائے تو نہیں؟"

بنسی نے کہا۔ "ہاں بنا رہا ہوں۔"

"میرے آقا کی وفات ہوگئی ہے۔ اب بوٹ بنانا بے کار ہے۔"

"ارے!"

وُہ تو گھر تک بھی نہیں پہنچنے پائے۔ گاڑی ہی میں جان نکل گئی۔ مالکہ نے کہا ہے کہ اس چمڑے کے سلیپر بنادو۔"

بلنسی نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ لو بھائی، سلیپر تیار ہیں"۔

نوکر حیرت زدہ سا سلیپر لے کر چلا گیا ــــ

(۶)

مینکو کو بلنسی کے پاس رہتے چھ برس گزر گئے۔ اب تک وُہ صرف دو بار ہنسا تھا ــــ ورنہ چپ چاپ بیٹھا اپنا کام کرتا رہتا تھا۔ بلنسی اس سے بیحد خوش تھا اور ڈرتا رہتا تھا کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔ اسی خوف سے بلنسی نے پھر کبھی اس سے اس کے گھر بار وغیرہ کے بارے میں سوال نہیں کیا۔

ایک دن مادھوی آگ جلا رہی تھی۔ بچے صحن میں کھیل رہے تھے بلنسی اور مینکو بیٹھے جوتے بنا رہے تھے کہ ایک بچے نے آکر کہا:۔

"چچا مینکو! دیکھو وُہ عورت، دو لڑکیاں ساتھ لئے آرہی ہے"

مینکو نے دیکھا۔ کہ ایک بڑھیا چادر اوڑھے، چھوٹی چھوٹی دو بچیوں کو ساتھ لئے آرہی ہے۔ لڑکیوں کی شکل و صورت، رنگ روپ بالکل ایک سا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ایک لنگڑی ہے۔

بڑھیا نے اندر آکر لڑکیوں کے لئے جوتے بنا دینے کو کہا۔ بلنسی ناپ لینے لگا۔ تو اس نے دیکھا کہ مینکو ان لڑکیوں کی طرف اس طرح دیکھ رہا ہے جیسے پہلے کبھی کہیں دیکھا ہو۔

بڑھیا نے کہا" اس لڑکی کا ایک پاؤں لنجا ہے۔ ایک ناپ اس کا لے لو۔ اور باقی تین پیر ایک جیسے ہیں ——— یہ دونوں توام بہنیں ہیں"۔
ناپ لے کر بنسی نے پوچھا۔" یہ لنگڑی کیسے ہو گئی؟ کیا پیدائشی نقص ہے؟"

" نہیں! اس کی ماں ہی نے اس کی ٹانگ کچل ڈالی تھی"۔ بڑھیا بولی
مادھوی نے پوچھا۔" تو کیا تم اِن کی ماں نہیں ہو؟"

" نہیں بہن، نہ ماں ہوں نہ رشتہ دار۔ یہ میری لڑکیاں نہیں، میں نے صرف اِن کی پرورش کی ہے"۔

" پھر بھی تم انہیں بڑا پیار کرتی ہو"۔

" پیار کیوں نہ کروں؟ میں نے اپنا دودھ پلا پلا کر انہیں بڑا کیا ہے میرا اپنا بھی ایک بچہ تھا۔ لیکن وُہ خدا کو پیارا ہو گیا۔ مجھے ان کے ساتھ اس سے بھی زیادہ محبت ہے"۔

" تو یہ کس کی لڑکیاں ہیں؟" مادھوی نے پوچھا۔

" چھ برس ہوئے" بڑھیا نے کہنا شروع کیا۔" اِن کے ماں باپ ایک ہفتے کے اندر اندر فوت ہو گئے۔ وُہ میرے ہمسائے تھے۔ ان کا باپ لکڑہارا تھا۔ بیچارہ لکڑیاں کاٹتا کاٹتا درخت کے نیچے آ کر مر گیا۔ منگل کے دن وہ فوت ہوا۔ اس کے تین دِن بعد شکروار کو یہ پیدا ہوئیں اور اسی دن ان کی ماں چل بسی۔ دوسرے دن جب میں اسے دیکھنے گئی تو دیکھا کہ بیچاری مری پڑی ہے۔ مرتے وقت کروٹ لیتے ہوئے اس لڑکی کی ٹانگ

اس کے نیچے دب گئی۔ گاؤں والوں نے اس کی تجہیز و تکفین کی۔ ان کے ماں باپ غریب تھے۔ ایک کوڑی تک پاس نہ تھی۔ لوگ سوچنے لگے کہ لڑکیوں کو کون پالے؟ اس وقت وہاں میری ہی گود میں دو مہینے کا بچہ تھا۔ سب نے یہی کہا۔ کہ جب تک کوئی انتظام نہ ہو، تم ہی ان کی پرورش کرو۔ میں نے انہیں سنبھال لیا۔ پہلے پہل تو میں اس لڑکی کو دودھ نہیں پلایا کرتی تھی کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ یہ مر جائے گی۔ لیکن پھر مجھے اس پر رحم آ گیا اور اسے بھی دودھ پلانے لگی۔ خدا کی مہربانی سے میری چھاتیوں میں اتنا دودھ آ گیا تھا کہ تینوں بچوں کو پلانے کے بعد بھی بہہ نکلتا تھا۔ میرا بچہ تو چند ماہ بعد ہی خدا کو پیارا ہو گیا اور یہ بڑھنے پھولنے لگیں۔ اب ہماری حالت پہلے سے بہت اچھی ہے۔ میرا شوہر ایک بڑے کارخانے میں ملازم ہے۔ میں انہیں پیار کیوں نہ کروں؟ یہ تو میری زندگی کا سہارا ہیں۔"

یہ کہکر بڑھیا نے دونوں لڑکیوں کو سینے سے لگا لیا۔

مادھوی نے کہا "سچ ہے۔ انسان ماں باپ کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن خدا کے بغیر۔ خدا کے کرم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ تمام جھونپڑی منور ہو گئی۔ سب نے دیکھا کہ میکو کونے میں بیٹھا ہنس رہا ہے۔

(۷)

بڑھیا لڑکیوں کو لے کر باہر چلی گئی۔ تو میکو نے اٹھ کر سینی اور مادھوی کو سلام کیا اور کہا "آقا! اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ خدا نے مجھ پر

رحم و کرم کیا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی، کوئی بھول چوک ہو گئی ہو تو مجھے معاف کرنا۔"

بلنتی اور مادھوی نے دیکھا کہ میکو کا جسم روشن و منور ہو رہا ہے۔ بلنتی سر جھکا کر بولا:۔

"میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم کوئی معمولی انسان نہیں ہو۔ اب میں تمہیں نہیں روک سکتا۔ نہ کچھ دریافت ہی کر سکتا ہوں۔ البتہ یہ بتا دو کہ جب میں تمہیں اپنے گھر لایا تھا تو تم بہت اداس تھے۔ جب میری بیوی نے تمہیں کھانا دیا تو تم ہنسے۔ پھر جب وہ امیر آدمی جوتا بنوانے آیا تو تم پھر ہنسے۔ آج یہ بڑھیا لڑکیوں کے ساتھ آئی اور اپنی کہانی سنائی تو تم تیسری بار ہنسے۔ اس میں کیا راز ہے؟ تمہارے چہرے پر اتنا نور اور جلال کیوں ہے؟"

میکو نے کہا۔" نور کی وجہ تو یہ ہے کہ خدا نے مجھ پر رحم کیا ——— میں اپنی غلطی کی سزا بھگت چکا۔ خدا نے تین باتوں کے سمجھنے کے لئے مجھے اس جہان فانی میں بھیجا تھا۔ تینوں باتیں میں سمجھ گیا، اس لئے تین موقعوں پر ہنسا۔"

۔" خدا نے تمہیں یہ سزا کیوں دی تھی؟ اور وہ باتیں کونسی ہیں؟" بلنتی نے پوچھا۔

" میں نے خدا کا حکم نہ مانا تھا۔ اس لئے یہ سزا دی گئی تھی۔ میں ایک فرشتہ ہوں۔ ایک دن خدا نے مجھے ایک عورت کی روح قبض کرنے کے

لئے بھیجا۔ میں نے دیکھا کہ عورت انتہائی نحیف و نزار ہے اور زمین پر پڑی ہے۔ پاس ہی دو نوزائیدہ توام لڑکیاں رو رہی ہیں۔ مجھے فرشتۂ اجل سمجھ کر وہ عورت بولی۔

" میرا شوہر درخت کے نیچے آ کر مر گیا ہے۔ میری نہ ماں ہے نہ بھائی نہ بہن۔ ان لڑکیوں کی پرورش کون کریگا ؟ میری جان نہ نکال۔ بچیاں ماں باپ کے بغیر کیونکر زندہ رہیں گی ؟" —— مجھے اس کی باتوں پر رحم آگیا اور میں نے بارگاہِ خداوندی میں جا کر عرض کی "اے مالک ! مجھے عورت کی باتوں پر رحم آگیا۔ اس کی توام لڑکیوں کی پرورش کرنے والا کوئی نہ تھا اس لیے میں نے اس کی روح قبض نہیں کی۔ کیونکہ ماں باپ کے بغیر بچے پل نہیں سکتے " خدا نے کہا۔" جاؤ، اور ابھی اس کی روح قبض کرو اور جب تک یہ تین باتیں نہیں جان لو گے کہ —— " انسان میں کونسی چیز ہے ؟ (۲) انسان کو کیا نہیں ملتا ؟ (۳) انسان کی زندگی کس چیز پر منحصر ہے ؟" اس وقت تک تم آسمان پر نہیں آ سکتے۔ میں نے زمین پر آ کر اس عورت کی جان نکال لی۔ مرتے وقت اس کے کروٹ لینے سے ایک لڑکی کی ٹانگ کچلی گئی۔ میں نے آسمان پر جانا چاہا۔ لیکن آندھی آ گئی، میرے پر غائب ہو گئے۔ اور میں اس سڑک پر ننگا ہو کر گر پڑا۔

(۸)

اب مٹنی اور مادھوی سمجھ گئے۔ کہ میکو کون ہے۔ دونوں بڑے خوش ہوئے کہ ہم نے خوش قسمتی سے فرشتے کی زیارت کر لی۔

مَیکوؔ نے پھر کہا۔" جبتک مَیں نے انسانی جسم نہیں پایا تھا، مَیں سردی گرمی اَور بھوک پیاس کی تکلیف نہیں جانتا تھا۔ لیکن انسانی قالب اختیار کرتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ سب کیا ہوتا ہے اَور دُکھ کسے کہتے ہیں۔ میں بھوک اور پیاس سے بے حال سڑک پر پڑا تھا کہ ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ دُنیا کے فانی میں آنے پر یہ پہلا آدمی تھا جو مجھے نظر آیا۔ اس کا چہرہ ایسا خوفناک تھا کہ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کی طرف دیکھ نہ سکا۔ وہ انسان کہہ رہا تھا کہ بیوی بچوں کی پرورش کیسے کریں، کپڑے کہاں سے لائیں۔ میں نے سوچا ــــ دیکھو، میں تو بھوک اَور پیاس سے مر رہا ہوں، یہ اپنا ہی رونا رو رہا ہے۔ میری کچھ مدد نہیں کرتا۔ وہ میرے قریب سے گزر گیا۔ تھوڑی دیر میں وُہ لوٹ کر میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ اب رحم و ہمدردی سے اس کا چہرہ حسین و پُر نور تھا۔ بلبنی! وہ انسان تم تھے۔ جب تم مجھے گھر لائے، مادھوی کا چہرہ تم سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔ کیونکہ اس میں رحم کا شائبہ تک نہ تھا۔ لیکن جب وہ مہربان ہو کر کھانا لائی تو اس کے چہرے سے درشتی کے آثار غائب تھے۔ مجھے پہلے سوال کا جواب مل گیا۔ میں سمجھ گیا۔ کہ انسان کی رُوح رواں محبت ہے۔ اس لئے میں پہلی بار مُسکرایا۔

ایک سال بعد وُہ امیر آدمی بوٹ بنوانے آیا۔ اسے دیکھ کر میں اس لئے ہنسا کہ بُوٹ تو ایک سال کے لئے بنواتا ہے اور یہ جانتا ہی نہیں کہ شام ہونے سے پہلے ہی مر جائیگا۔ اس وقت مجھے دوسری بات کا بھی علم ہو گیا۔ کہ انسان جو چاہتا ہے وُہ اسے نہیں ملتا۔ اس لئے دوسری بار ہنسا۔

چھ سال کے بعد آج یہ بڑھیا آئی تو مجھے معلوم ہو گیا کہ سب کی زندگی کا سہارا خدا ہے اور کوئی نہیں۔ اس لئے تیسری بار مسکرایا۔

(۹)

میکو اب سراپا نور ہو گیا تھا۔ اس پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ وہ پھر کہنے لگا۔۔۔

" دیکھو، انسان محبت سے زندہ رہتے ہیں۔ محبت پر انسانی زندگی کا دارو مدار ہے۔ صرف کھانے پہننے سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس عورت کو کیا معلوم تھا کہ اس کی لڑکیوں کی کون پرورش کریگا؟ وہ دولتمند کیا جانتا تھا کہ گاڑی ہی میں مر جاؤں گا؟ گھر پہنچنا نصیب ہی نہ ہو گا۔ کون جانتا ہے کہ کل کیا ہو گا؟ کپڑے کی ضرورت پڑے گی یا کفن کی!

انسانی قالب میں میں صرف اس لئے زندہ رہا کہ تم نے اور تمہاری بیوی نے مجھ سے محبت کا برتاؤ کیا۔ وہ یتیم لڑکیاں اس لئے بڑی ہوئیں کہ ایک بڑھیا نے محبت سے مجبور ہو کر انہیں دودھ پلایا۔ مختصر یہ کہ انسان اپنی کوششوں سے زندہ نہیں رہتا، محبت اسے زندہ رکھتی ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ دنیا والوں کا فرض صرف جینا ہے، جینا ۔۔۔۔ زندہ رہنا، لیکن اب معلوم ہوا کہ انسان کا مذہب صرف جینا ہی نہیں بلکہ پیار اور محبت سے زندہ رہنا ہے اسی لئے خدا نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کیا چاہیئے۔ بلکہ یہ بتایا ہے کہ ہمیں کیا چاہیئے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان محبت سے رہیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ انسانوں کی زندگی کا انحصار محبت پر ہے۔ محبت کرنے والا خدا

کے قریب اور خدا محبت کرنے والے کے دل میں رہتا ہے ——— خدا اور محبت میں کوئی فرق و امتیاز نہیں، ع :-

"محبت ہی خدا ہے اور محبت ہی خدائی ہے"

یہ کہہ کر فرشتہ آسمان کی طرف پرواز کر گیا اور فضا میں یہ الفاظ گونج اٹھے :-

"محبت خدا ہے، خدا ہے محبت!"



روشنی

کسی مہاتما کی دُعا سے ایک غریب کسان کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا۔ مہاتما نے کہہ رکھا تھا کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی کسی آدمی کو اس کا دھرم پتا، اور کسی عورت کو اس کی دھرم ماتا بنا دینا، ورنہ بچے کی جان کو خطرہ ہے۔

بچے کی پیدائش کے دوسرے ہی دن کسان نے ایک ہمسائے سے کہا۔ کہ وہ اس کے بیٹے کا دھرم پتا بن جائے۔ لیکن وہ ایک کنگال کے بیٹے کا دھرم کا باپ بننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ بیچارہ باپ تمام گاؤں میں پھرا۔ لیکن کسی نے حامی نہ بھری۔ مایوس ہو کر وہ دوسرے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک سادھو مہاتما سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے اس سے پوچھا "کہو بیٹا کہاں جاتے ہو؟"

بوڑھے نے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ یہ سن کر وُہ سادھو، لڑکے کا دھرم پتا بننے کو تیار ہو گیا۔ کسان نے خوش ہو کر کہا۔ "مہاراج! آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ لیکن اب یہ بتا دیجئے کہ دھرم ماتا کون بنے؟"

مہاتما نے کہا۔ "یہاں سے تھوڑی دُور ایک شہر ہے۔ چوک میں ایک دولتمند سوداگر کا مکان ہے۔ وہاں چلے جاؤ۔ دروازے پر ہی تمہیں وہ سوداگر مل جائیگا۔ یہ سب حال اسے سنا کر کہنا کہ آپ اپنی بیٹی سے کہہ دیجئے کہ

وہ میرے لڑکے کی دھرم ماتا بن جائے۔"

کسان نے کہا "مہاراج! ایسے دولت مند آدمی سے یہ بات کیسے کہہ سکتا ہوں۔ وہ تو شاید مجھ سے بات بھی نہ کرے۔"

"نہیں، یہ بات نہیں، تم فوراً وہاں پہنچو!"

کسان سیدھا اس سوداگر کے پاس پہنچا۔ سوداگر نے بڑی خوشی سے اپنی بیٹی کو اس کے لڑکے کی دھرم ماتا بنانا منظور کر لیا۔

(۲)

وہ لڑکا بڑا ہوشیار اور ذہین تھا۔ دس برس کی عمر میں اس کا ذہن ایسا تیز تھا، کہ جو علم دوسرے لڑکے پانچ برس میں سیکھتے تھے۔ وہ ایک برس میں حاصل کر لیتا تھا۔

ایک دفعہ دیوالی کے تہوار پر موہن اپنے والدین سے اجازت لے کر اپنی دھرم کی ماں کو پرنام کرنے شہر گیا۔ شام کے وقت وہ گھر واپس آگیا اور باپ سے کہا۔ "پتا جی! اپنی دھرم ماتا کو تو میں پرنام کر آیا ہوں، لیکن دھرم پتا کے درشن نہیں کر سکا۔ مہربانی کر کے مجھے ان کا پتہ بھی بتا دیجئے!"

باپ نے کہا۔ "بیٹا! افسوس ہے کہ ہمیں خود ان کی جائے رہائش کا پتہ معلوم نہیں۔ تمہارے نام کرن کے بعد ہم نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

موہن نے کہا۔ "میں ان کے ضرور درشن کروں گا۔ آپ مہربانی کر کے مجھے اجازت دیجئے، میں کہیں نہ کہیں انہیں تلاش کر ہی لوں گا!"

ماں باپ نے اسے اجازت دے دی اور اس نے جنگل کی راہ لی۔

(۳۱)

اچانک راستے میں موہن کو ایک مہاتما دکھائی دیئے۔ انہوں نے موہن سے پوچھا "بیٹا! کہاں جا رہے ہو؟"

موہن نے اپنا حال بتا کر کہا کہ "میں اپنے دھرم پتا کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

مہاتما نے کہا۔ "بیٹا! میں ہی تمہارا دھرم پتا ہوں۔"

موہن نے خوش ہو کر ان کے چرن چھوئے اور پوچھا۔ "اب آپ کدھر جا رہے ہیں؟ اگر میرے ساتھ گھر چلیں تو زہے قسمت! ورنہ میں آپ کے ساتھ چلونگا۔"

" اس وقت تو میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ بہت سے ضروری کام درپیش ہیں۔ میں کل اپنے مقام پر واپس پہنچوں گا۔ تم کل وہاں آ جانا۔"

موہن نے کہا۔ "مجھے آپکی جگہ کا پتہ نہیں۔ آؤنگا کیسے؟"

مہاتما بولے :۔ "کل صبح اپنے گھر سے نکل کر سیدھے مشرق کی طرف روانہ ہونا۔ کچھ دور چل کر تمہیں ایک جنگل ملے گا۔ وہاں ایک گھاٹی ہے۔ اس گھاٹی میں بیٹھ کر ذرا آرام کر کے دیکھنا کہ کیا ہوتا ہے؟ اور جو کچھ دیکھو اسے ذہن نشین کر لینا۔ پھر وہاں سے آگے روانہ ہو کر جنگل سے باہر آنے پر ایک باغ آئے گا۔ اس میں سنہری چھت والا مکان میرا ہے۔ میں دروازے پر ہی تمہیں مل جاؤنگا۔"

یہ کہہ کر مہاتما چلے گئے اور موہن گھر واپس آ گیا۔

(۴)

دوسرے دن صبح موہن نے جنگل کی راہ لی۔ مشرق کی جانب چلتے چلتے وہ گھاٹی میں پہنچ گیا۔ دیکھا کہ گھاٹی کے درمیان ایک چیڑ کا درخت ہے۔ اس کی شاخوں میں رسّے سے بندھا ہوا ایک شہتیر لٹک رہا ہے اور شہتیر کے عین نیچے شہد سے بھرا ہوا ایک کنڈ ہے۔ موہن بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ریچھنی اپنے چار بچوں سمیت آتی دکھائی دی۔ وہ سب وہاں دوڑ کر پہنچے۔ ریچھنی شہتیر کو سر سے دھکّا مار کر شہد کھانے لگی اور بچوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اتنے میں شہتیر واپس آ کر بچوں کو لگا۔ ریچھنی نے اُسے پھر دھکّا دیا۔ وہ واپس آ کر ایک بچے کی پشت پر لگا۔ بچے دُور ہٹ گئے۔ ریچھنی نے شہتیر کو پھر بڑے زور سے دھکا مارا۔ بچے پھر آ کر شہد کھانے لگے شہتیر واپس لوٹ کر ایک بچے کے ایسا لگا کہ وہ وہیں مر گیا۔ ریچھنی نے غضب ناک ہو کر شہتیر کو ایک ایسا جھٹکا دیا کہ رسّا ٹوٹ گیا۔ شہتیر ریچھنی کے سر پر گرا اور وہ وہیں دب کر مر گئی۔

(۵)

موہن اس منظر کا مطلب کچھ نہ سمجھا اور وہاں سے چل دیا۔ باغ میں پہنچا تو سادھو مہاتما اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے اندر لے گیا۔ موہن نے ایسا خوبصورت اور دلکش مقام پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مہاتما نے اسے تمام محل دکھایا اور پھر ایک دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔ "بیٹا! دیکھو،

اِس دروازے میں تالا نہیں، صرف مُہر لگی ہوئی ہے۔ یہ دروازہ آسانی سے کھُل سکتا ہے۔ لیکن تم اسے کھولنے کا کبھی ارادہ نہ کرنا۔ جب تک تمہارا جی چاہے اس گھر میں رہو۔ لیکن اس دروازے کو کبھی ہاتھ نہ لگانا اور اگر کبھی نادانی سے کھول بھی بیٹھو تو ریچھنی والے منظر کو پیش نظر رکھنا۔"

دوسرے دن سادھو تو کہیں باہر چلا گیا۔ موہن آرام سے وہاں رہنے لگا۔ رہتے رہتے اسے تین برس گزر گئے۔ ایک دن وُہ مُہر والے دروازے پر کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ دھرم پتا نے اِس دروازے کو کھولنے کی ممانعت کیوں کی ہے۔ دیکھوں تو اس کے اندر کیا ہے؟

دھکا دینے پر مُہر ٹوٹ گئی اور دروازہ کھل گیا۔ اس نے دیکھا۔ اندر بڑا دالان ہے۔ درمیان میں ایک تخت بچھا ہوا ہے اور اس پر ایک پیالہ پڑا ہے موہن نے جھٹ تخت پر چڑھ کر پیالہ اٹھا لیا۔ پیالہ اٹھاتے ہی دالان تو غائب ہو گیا اور اسے تمام دُنیا نظر آنے لگی۔ کہیں سمندر، کہیں زمین، کہیں جنگل، کہیں پہاڑ، کہیں آبادی، کہیں ویرانہ، کہیں شریف، کہیں رذیل، سب آنکھوں کے سامنے آ گئے۔

اب موہن نے سوچا کہ چلو اپنے کھیت تو دیکھیں، اناج کیسا پیدا ہوا ہے؟ اس نے دیکھا کہ فصل پختہ ہو گئی ہے۔ اور دُلّا چور رات کو فصل کاٹ کر اپنے گھر لے جانا چاہتا ہے۔ موہن نے سوچا کہ یہ تو تمام فصل چُرا کر لے جائیگا۔ مجھے باپ کو خبردار کر دینا چاہیئے ——— اس نے اپنے باپ کو جگا دیا۔ باپ نے پڑوسیوں کو جمع کر کے دُلّا کو کھیت میں جا پکڑا اور جیل میں بھجوا دیا۔

اب موہن نے خیال کیا کہ اپنی دھرم ماتا کو دیکھیں وہ کیا کرتی ہے ؟
اس کی دھرم ماتا کی شادی ایک سوداگر سے ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ سو رہی تھی۔ اس کا خاوند اسے سوتے چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے پاس چل دیا تھا۔ موہن نے یہ حال دیکھ کر اپنی دھرم کی ماں کو جگا دیا اور کہا کہ تمہارا شوہر فلاں عورت کے پاس گیا ہے۔ دھرم ماتا نے اس عورت کے گھر جا کر اُسے خوب پیٹا اور اپنے شوہر کو ساتھ لے آئی۔

(۶)

اس کے بعد موہن نے دیکھا کہ اس کی ماں جھونپڑے میں سو رہی ہے ایک چور گھر میں گھس کر صندوق توڑنے لگا ہے۔ ماں جاگ اٹھی۔ چور اسے مارنے دوڑا۔ موہن نے غصے میں وہی پیالہ چور کو دے مارا۔ چور وہیں مر گیا اور پیالہ زمین پر جا گرا۔

پیالہ ہاتھ سے نکلتے ہی تمام دنیا غائب ہو گئی۔ وہ اسی دالان میں بیٹھا تھا اور دھرم پتا باہر سے آ کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے موہن کو تخت سے نیچے اُتار کر کہا ـــــ "آخر تم نے میرا حکم نہ مانا۔ دیکھو! پہلا گناہ تو تم نے یہ کیا کہ مُہر توڑی، دُوسرا گناہ یہ کہ تخت پر بیٹھ کر میرا پیالہ ہاتھ میں لیا، تیسرا گناہ یہ کہ پیالہ ہاتھ میں لے کر دنیا میں اتنا گناہ پھیلا دیا کہ اگر تم آدھ گھنٹہ اور اس جگہ بیٹھے رہتے تو آدھی دُنیا تباہ ہو گئی ہوتی۔ دیکھو میں خود تخت پر بیٹھ کر تمہیں دکھاتا ہوں کہ تم نے کیا کر ڈالا ہے ؟"
یہ کہہ کر وُہ تخت پر بیٹھ گیا اور پیالہ ہاتھ میں لے لیا۔ پھر تمام دُنیا

آنکھوں کے سامنے آگئی۔

اس نے موہن سے کہا ــــ" دیکھ! تو نے اپنے باپ کا کیا حال کر دیا ہے۔ تیرا چور جیل میں رہ کر سب قسم کی برائیاں سیکھ گیا ہے۔ اب اسکی اصلاح ناممکن ہے۔ وہ باہر آکر تیرے باپ کے بیل چرا چکا ہے۔ اس وقت وہ کھلیان میں آگ لگانے کو تیار ہے اور یہ سب تیری ہی کرتوت ہے"

موہن کو باپ کا یہ حال دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا۔

سادھو نے کہا ــــ" دیکھ! اب ادھر دیکھ، یہ تیری دھرم ماتا کا شوہر ہے۔ اس نے غیر عورت کے بس میں ہو کر اپنی بیوی کو چھوڑ دیا ہے۔ اسکی پہلی محبوبہ بیسوا بن گئی ہے۔ تیری دھرم ماتا درد و غم سے مجبور ہو کر شراب پینے لگی ہے۔ دیکھا؟ ــــ اچھا، اب اپنی ماں کا حال دیکھ، وہ کیا کر رہی ہے ــــ"

ماں کہہ رہی تھی ــــ" کیا اچھا ہوتا، اگر چور مجھے اس رات مار ڈالتا میں ان گناہوں سے تو بچ جاتی!"

پھر سادھو نے موہن کو جیل کا منظر دکھایا ــــ دو سپاہی ایک ڈاکو کو پکڑے کھڑے ہیں۔

سادھو نے کہا ــــ" دیکھ! اس ڈاکو نے دس آدمیوں کو قتل کیا ہے۔ مناسب یہ تھا کہ وہ اپنے جرائم پر خود نادم ہوتا۔ لیکن تو نے اسے مار کر اس کے تمام گناہ اپنے سر لے لئے۔ گناہوں کی سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔ اگر تو نے وہ بچھی والا منظر یاد رکھا ہوتا تو تیری یہ حالت نہ ہوتی۔ دیکھ

نرکچھپی نے شہتیر کو پہلی بار دھکیلا تو بچے ڈر گئے، پھر دھکیلا تو ایک بچہ مر گیا اور تیسری بار خود جان کھو بیٹھی۔ یہی تو نے کیا۔ اب یہی علاج ہے کہ تیس برس تک تپسیا کرکے، تو ڈاکو کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے۔ ورنہ اس کے عوض تجھے نرک بھوگنا پڑے گا۔"

"ڈاکو کے گناہوں کا کفارہ میں کیسے ادا کر سکتا ہوں؟" موہن نے پوچھا۔

سادھو نے کہا ــــ "تو نے دنیا میں جتنا گناہ پھیلایا ہے، اُسے دُور کر دینا ہی ڈاکو کے اور تیرے گناہوں کا کفارہ ہے۔"

"میں دنیا سے گناہ کو کیونکر دُور کر سکتا ہوں؟"

"مشرق کی طرف جانے پر تجھے کھیت میں کچھ انسان ملیں گے، اپنی عقل و فہم کے مطابق انہیں صحیح راہ بتانا اور راستے میں جو کچھ دیکھے اسے یاد رکھنا۔ چوتھے دن تجھے ایک جنگل ملے گا۔ وہاں ایک کٹیا ہے جس میں ایک سادھو رہتا ہے۔ اسے یہ سب داستان سنانا۔ وہ تجھے پرائشچت (کفارہ) کا طریقہ بتلائے گا۔ اس کے حکم کے مطابق تپسیا کرنے سے تیرے گناہ دھل جائیں گے۔"

موہن یہ باتیں سن کر وہاں سے چل دیا۔

(۷)

راستے میں موہن یہ سوچتا جا رہا تھا کہ اپنے اوپر گناہ لئے بغیر دنیا سے گناہ کس طرح مٹایا جا سکتا ہے؟ گنہگاروں کو جیل بھیجنے یا قتل کرنے

ہی سے گناہ مٹ سکتا ہے اور کوئی طریق نہیں۔

اس نے دیکھا کہ کھیت میں ایک بچھڑا گھس گیا ہے۔ لوگ اُسے باہر نکالتے ہیں۔ لیکن وہ نکلتا نہیں۔ ایک بڑھیا باہر کھڑی پکار رہی ہے کہ میرے بچھڑے کو کیوں مارتے ہو؟"

موہن نے کسانوں سے کہا کہ تم کیوں خواہ مخواہ شور مچاتے ہو، باہر آجاؤ۔ بڑھیا خود ہی بچھڑے کو باہر بلا لے گی۔

کسان باہر آگئے۔ بڑھیا نے بچھڑے کو پکارا، وہ جھٹ دوڑ کر باہر آگیا اور بڑھیا کے ساتھ چلنے لگا۔

موہن یہ تو سمجھ گیا کہ پاپ سے پاپ بڑھتا ہے۔ انسان گناہ کی مدد سے گناہ کو مٹانے کی جتنی کوشش کرتا ہے اُتنا ہی گناہ پھیلتا ہے۔ لیکن اسے مٹایا کیسے جاتے؟ اگر بڑھیا کے پکارنے سے بچھڑا باہر نہ نکلتا تو کیا ہوتا ___؟

(۸)

دوسرے دن موہن ایک گاؤں میں پہنچا۔ دیکھا، ایک عورت میلے کچیلے کپڑے سے چوکی صاف کر رہی ہے۔ وہ جتنا صاف کرتی ہے، چوکی اتنی ہی اور میلی ہوتی جا رہی ہے۔ موہن کے دریافت کیے پر عورت نے کہا ___" چوکی صاف کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ لیکن یہ صاف ہونے ہی میں نہیں آتی۔"

موہن نے کہا۔" صاف کیسے ہو۔ کپڑا تو میلا ہے۔ پہلے کپڑے کو

دھو کر صاف کرو۔ پھر چوکی فوراً صاف ہو جائیگی۔"
عورت نے ایسا ہی کیا اور چوکی صاف ہو گئی۔
اگلے دن موہن جنگل میں پہنچا۔ دیکھا کہ چند آدمی لوہے کی سلاخ کو ایک کھمبے سے باندھ کر موڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن وہ مڑتی ہی نہیں۔ لوگ خود چکر کھاتے چلے جاتے ہیں۔
بات یہ تھی کہ جس کھمبے سے انہوں نے سلاخ کا سرا باندھ رکھا تھا، وہ خود گھومتا تھا۔ اس لیئے سب کے سب چکر لگا رہے تھے اور سلاخ کے ساتھ ساتھ کھمبا بھی چکر لگا رہا تھا۔ موہن نے پوچھا ـــــ "یہ کیا کر رہے ہو؟"
"تم دیکھتے نہیں، ہم اس سلاخ کو موڑ رہے ہیں۔ ہم تو زور لگاتے لگاتے تھک گئے ہیں۔ لیکن یہ مڑتی ہی نہیں۔"
موہن نے کہا۔ "مڑے کیسے؟ کھمبا تو گھوم رہا ہے۔ اگر پہلے کھمبے کو مضبوط کر لو تو سلاخ فوراً مڑ جائیگی۔"
چنانچہ کھمبے کو مضبوط کرنے کے بعد سلاخ فوراً مڑ گئی۔
آگے چل کر موہن نے دیکھا کہ کچھ چرواہے سردی سے بچنے کے لئے آگ جلا رہے ہیں۔ انہوں نے خشک لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ جلائی اور پھر اوپر نم آلود گھاس ڈال دی۔ آگ فوراً بجھ گئی۔ انہوں نے کئی بار ایسا ہی کیا۔ لیکن آگ نہ جلی۔
موہن نے کہا ـــ "بھائیو! ذرا صبر سے کام لو۔ پہلے آگ کو اچھی طرح دہک لینے دو۔ پھر گھاس ڈالنا۔"

چرواہوں نے اس کی بات پر عمل کیا اور آگ جلنے لگی۔ لیکن موہن ان
ظر کا مطلب کچھ نہ سمجھا۔

(۹)

چوتھے دن موہن سادھو کی کٹیا پر پہنچ گیا۔

سادھو نے پوچھا" کون ؟"

موہن نے جواب دیا" ایک گناہگار، پاپی — مہاں پاپی، میں اپنے اور دوسروں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں"

سادھو نے باہر آکر پوچھا" کون سے گناہ ؟"

موہن نے ابتدا سے انتہا تک تمام حال بیان کر کے کہا۔" مہاراج! یہ تو میں سمجھ گیا ہوں کہ گناہ سے گناہ کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس سے وہ اور بڑھتا ہے۔ براہِ کرم آپ مجھے یہ بتائیے کہ گناہ کو دنیا سے مٹایا کس طرح جا سکتا ہے —— کس طرح اسے نیست و نابود کیا جا سکتا ہے ؟"

" اچھا میرے ساتھ آؤ!"

سادھو نے موہن کو جنگل میں لے جا کر ایک کلہاڑی دیتے ہوئے کہا" اس درخت کو کاٹ کر اس کے تنے کے تین ٹکڑے کر کے انہیں آگ سے جھلس دو"

موہن نے ایسا ہی کیا۔

پھر سادھو نے کہا۔" اچھا، اب انہیں یہاں زمین میں گاڑ دو۔ سامنے پہاڑی کے نیچے ایک ندی بہتی ہے، وہاں سے منہ میں بھر بھر کر پانی لاؤ۔ اور

انہیں سینچتے رہو۔ ایک ٹنڈ عورت کا، دوسرا کسان کا اور تیسرا چرواہوں کا ہے
جب تینوں ٹنڈ ہرے ہو جائیں، تو سمجھ لینا کہ تیری تپسیا (ریاضت) مکمل ہو
گئی۔"

یہ کہکر سادھو اپنی کٹیا میں چلا گیا۔

(۱۰)

جب موہن اُن ٹنڈوں کو پانی دے کر شام کے وقت جھونپڑی میں پہنچا
تو اس نے دیکھا۔ کہ سادھو مرا پڑا ہے۔ اس نے سادھو کا کریا کرم کیا۔

لوگوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ سادھو کا دیہانت ہو گیا ہے اور وہ
موہن کو اپنا چیلہ اور جانشین بنا کر کٹیا میں چھوڑ گیا ہے۔ اس علاقے میں سادھو
کی بڑی شہرت و عزت تھی۔ اس لئے موہن کو کھانے پینے کی کمی نہ رہی۔

ایک سال کے اندر اندر دُور دُور تک یہ بات پھیل گئی کہ موہن ہر روز
منہ میں پانی بھر بھر کر لاتا اور اس سے ٹنڈوں کو سینچ کر سخت تپسیا کر رہا ہے
پھر کیا تھا، چڑھاوا چڑھنے لگا۔ دُنیا بھر کے غرضمند دُور دُور سے چلکر وہاں
آنے لگے اور موہن کی پرستش ہونے لگی۔ لیکن اس کا یہ اصول تھا کہ جو کچھ آتا،
غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔ اپنے لئے صرف پیٹ بھر کھانے کے لئے اناج رکھ
لیتا۔

اُسے ٹنڈ سینچتے کئی برس ہو گئے۔ لیکن ان میں سے ایک بھی سرسبز نہ ہوا
ایکدن اسے کٹیا کے قریب سے ایک گھوڑ سوار جاتا دکھائی دیا۔ موہن نے باہر
نکل کر پوچھا "تم کون ہو؟"

اس نے کہا۔ "میں ڈاکو ہوں۔ انسانوں کو قتل کر کے ان کا مال و دولت چھین کر عیش کرتا ہوں۔"

موہن نے سوچا کہ اس کی اصلاح ناممکن ہے۔ لوگ تو میرے پاس آ کر اپنے گناہوں پر پچھتانے اور ندامت کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اسے اپنے گناہوں پر فخر و ناز ہے۔ اُف! اگر یہ ڈاکو یہاں آتا جاتا رہا تو لوگ خوف کے مارے میرے پاس آنا چھوڑ دیں گے اور مجھے بھوکا مرنا پڑے گا۔ اس نے ڈاکو سے کہا:۔

"تمہاری بات سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی ہے۔ لوگ تو میرے پاس آ کر اپنے گناہوں کو یاد کر کے روتے اور پچھتاتے ہیں۔ لیکن تو ان پر ناز کرتا ہے۔ شاید تجھے خدا کا خوف نہیں۔ دیکھ، تیرے آنے سے لوگ خوفزدہ ہو کر یہاں آنا چھوڑ دیں گے۔ اس لئے تو یہاں سے چلا جا اور پھر کبھی نہ آنا۔"

ڈاکو نے کہا۔ "میں خدا سے نہیں ڈرتا۔ رہی چوری، تو اس میں گناہ ہی کیا ہے؟ تو تپسیا سے پیٹ بھرتا ہے، میں چوری سے۔ پیٹ تو سب ہی کو بھرنا پڑتا ہے۔ یہ باتیں انہیں بیوقوفوں کو سکھانا، مجھے کیا سکھاتا ہے۔ میں تو خدا کے نام پر کل آدر دو انسانوں کو قتل کر ڈالوں گا۔ بس یا کچھ اور بھی؟ میں تیرے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔ دیکھ، پھر میرے منہ نہ آنا!"

یہ کہہ کر ڈاکو وہاں سے چل دیا۔

(۱۱)

موہن کو وہاں رہتے رہتے آٹھ برس گزر گئے۔ ڈاکو کے خوف سے لوگوں

نے کٹیا پر آنا چھوڑ دیا۔ موہن کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ ایک دن اس نے دل میں سوچا ــــــ

" ڈاکو سچ کہتا تھا۔ میں نے بلاشبہ تپسیا کو ذریعۂ معاش بنا لیا تھا۔ سادھو نے تو تپ کرنے کو کہا تھا، لیکن میں نے مہنت بن کر اپنی پرستش شروع کروا دی۔ جب لوگ یہاں آ کر میری تعریف کرتے تو میں خوش ہوتا تھا۔ اب نہیں آتے تو کچھ تکلیف محسوس کی۔ کیا اس کا نام تپسیا ہے؟ عزت و شہرت کے لالچ میں پھنس کر گناہوں کو نابود تو کیا کرنا تھا اور جمع کر لیے۔ اب تنہائی میں بیٹھ کر پہلے دل کو پاک وصاف کر دوں، پھر کچھ ہوگا ورنہ نہیں۔"

یہ فیصلہ کر کے وہ کٹیا چھوڑ کر جنگل کو چل دیا۔

راستے میں پھر ڈاکو سے ملاقات ہو گئی۔ ڈاکو نے کہا۔ "کیوں، آج کہاں چلے سادھو مہاراج؟"

" میں تنہائی میں تپسیا کرنے جا رہا ہوں۔"

" تو پیٹ کہاں سے بھرو گے؟"

" جو ایشور کو منظور!"

ڈاکو تو یہ سن کر چل دیا۔ موہن سوچنے لگا۔ میں نے اسے نصیحت کیوں نہ کی؟ آج تو اس کا چہرہ قدرے سکون آمیز معلوم ہوتا تھا۔ شاید میری نصیحت مان لیتا۔ اس نے پھر ڈاکو کو آواز دی ــــــ "او بھائی ڈاکو! دیکھو خدا ہر جگہ موجود ہے۔ اب بھی مان جاؤ اور برے کام چھوڑ دو۔"

ڈاکو یہ سن کر، چھرا نکال کر موہن کو مارنے دوڑا۔ موہن ڈر کے مارے

جنگل میں بھاگ گیا۔

ڈاکو نے کہا " جا، اب چھوڑ دیتا ہوں۔ پھر کبھی میرے منہ آیا، تو مار ہی ڈالوں گا۔"

شام کو جب موہن ٹنڈوں کو سینچنے گیا۔ تو اس نے دیکھا، عورت والا ٹنڈ سرسبز ہو گیا ہے۔

(۱۲)

اب موہن دل و جان سے خلوت گزیں ہو گیا۔ ایک دن جب وہ بھوک سے بیتاب ہو کر جنگلی پھل کھانے کے لئے غار سے باہر نکلا۔ تو دیکھا کہ سامنے درخت سے ایک کپڑے میں بندھی ہوئی روٹی لٹک رہی ہے۔ روٹی لے کر وہ غار میں چلا آیا۔

اب، جب بھی اسے بھوک ستاتی، وہ غار سے باہر نکلتا اور اسے درخت سے بندھی ہوئی روٹی مل جاتی۔ لیکن اب اُسے ہر وقت یہ خوف لاحق رہتا، کہ تپسیا مکمل ہونے سے پہلے ڈاکو مجھے قتل نہ کر ڈالے۔ اگر کبھی ڈاکو کی آہٹ پاتا تو غار میں چھپ جاتا۔ دس برس کے بعد ایک دن وہ ٹنڈوں کو پانی دے رہا تھا تو اس کے دل میں خیال آیا کہ میں جو موت سے ڈرتا ہوں، یہ بھی تو گناہ ہے۔ شاید میں مرنے کے بعد گناہوں سے نجات ہی حاصل کر سکوں نفع و نقصان سب خدا کے ہاتھ ہے۔ انسان کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اس خیال کے آتے ہی وہ بے خوف و خطر ڈاکو کی تلاش میں چلا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا، کہ اسے سامنے سے ڈاکو آتا دکھائی دیا۔ ڈاکو نے ایک آدمی

کو ہاتھ پیر باندھ کر گھوڑے پر لاد رکھا تھا۔
موہن نے پوچھا " بھائی یہ کون ہے ؟ اور اسے کہاں لئے جاتے ہو؟"
ڈاکو نے جواب دیا " یہ ایک دولتمند سوداگر کا بیٹا ہے۔ اپنے باپ کی دولت کا پتہ نہیں بتاتا۔ میں اسے جنگل میں لے جاکر، ایک درخت سے باندھ کر اتنے چابک ماروں گا کہ یہ خود ہی سب کچھ بتا دیگا۔"
" نہیں، نہیں، ایسا نہ کہو۔ اسے چھوڑ دو۔" موہن نے عاجزی سے کہا۔
" کیوں، کیا تمہارا جی بھی مار کھانے کو چاہتا ہے؟ اپنا راستہ لو ورنہ ابھی قتل کر ڈالوں گا۔"
موہن نے بے خوفی سے کہا " میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ خدا سے ڈرو اور اسے چھوڑ دو۔"
" خیر، اسے تو چھوڑ دیتا ہوں —— لیکن دیکھو، میں کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ میرے سامنے نہ آیا کرو۔ لیکن تم مانتے ہی نہیں۔"
" بھائی، پرمیشور کے لئے یہ ڈکیتی چھوڑ دو۔"
ڈاکو نے آدمی کو چھوڑ دیا اور بغیر کچھ کہے چلا گیا۔ وہ نوجوان خوش ہو کر موہن کا شکریہ ادا کرتا ہوا گھر چلا گیا۔
شام کو موہن نے جاکر دیکھا۔ تو کسانوں والا ٹھنٹھ سرسبز ہو گیا تھا۔

(۱۳)

دس برس اور گذر گئے۔ موہن اب بھی تپسیا میں مگن رہتا تھا ایک دن

وہ سوچنے لگا ــــــ خدا کتنا رحیم و کریم ہے! انسان پر کتنا مہربان! اس نے انسان کے لئے کیسی کیسی عجیب چیزیں پیدا کی ہیں! اس پر بھی انسان آلام و مصائب کا شکار کیوں ہے؟ ــــــ سکون و راحت سے زندگی کیوں بسر نہیں کرتا؟ ــــــ میرے خیال میں یہ صرف جہالت کا اثر ہے۔ اگر انسانوں کو پیار اور محبت سے نصیحت کی جائے تو وہ سکونِ دل حاصل کر سکتے ہیں خلوت گزیں ہونا گناہ ہے۔ میرا فرض ہے کہ اس تپسیا سے مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ دوسروں کو بتاؤں اور انہیں راستی کا طریق سکھاؤں۔

اس کا دل ہمدردئ انسان سے لبریز ہو گیا۔ اتنے میں اسے ڈاکو آتا دکھائی دیا۔ پہلے تو اس نے خیال کیا کہ اسے سمجھانا بیکار ہے۔ لیکن پھر سوچا یہ تو میرا فرض ہے کہ انسانوں سے محبت کروں اور انہیں محبت سے رہنا سکھاؤں۔

اس نے دیکھا۔ ڈاکو آنکھیں جھکائے مغموم سا اس کی طرف آ رہا ہے۔ اس نے دوڑ کر ڈاکو کو گلے سے لگا لیا۔ اور کہا:۔

"بھائی، پیارے بھائی، اپنی حقیقت کو پہچانو۔ دیکھو، تمہارے دل میں پرماتما براجمان ہے۔ جہالت کے باعث تم لوگوں کو تکلیف دیتے اور خود تکلیف اٹھاتے ہو؟ بھائی! میرا کہنا مانو۔ خود کو تباہ نہ کرو، اپنے آپ پر ظلم نہ کرو، مان جاؤ ــــــ میرے بھائی مان جاؤ۔"

ڈاکو نے اس کے بازوؤں سے خود کو آزاد کرانا چاہا۔ لیکن اس نے اسے زور سے جکڑ کر روتے ہوئے کہا۔" مان جاؤ، راہ راست پر آ جاؤ! میں تمہارے

ہی فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں۔"

ڈاکو کا دل بھر آیا۔ وہ موہن کے قدموں میں گر کر بولا۔ "مہاراج! آج تم نے مجھے شکست دی۔ بیس برس تک میں تمہارا سامنا کرتا رہا، میں نے تمہاری ایک نہ سنی۔ لیکن آج بے بس ہوں۔ دیکھو، پہلی بار جب تم نے مجھے نصیحت کی تو مجھے بہت طیش آیا تھا۔ پھر جب تم غار میں گوشہ نشین ہو کر تپسیا کرنے لگے تو میں سمجھ گیا کہ تم بیراگی ہو گئے ہو۔ اسی دن سے میں تمہارے لئے درخت میں روٹی لٹکانے لگا۔"

اس وقت موہن کے ذہن میں آگیا کہ عورت اسی حالت میں چوکی کو صاف کر سکتی تھی، جب پہلے کپڑے کو صاف کر لیتی۔ یعنی اپنا دل آلائشوں سے پاک و صاف کرنے کے بعد ہی دوسروں کے دل پاک و صاف کئے جا سکتے ہیں

ڈاکو نے پھر کہا۔ "جب تم موت سے بے خوف ہو گئے۔ تو میرے دل پر بے حد اثر ہوا۔"

موہن سمجھ گیا کہ جس طرح کھمبے کو مضبوط کئے بغیر سلاخ نہیں مڑ سکتی تھی، اسی طرح اپنے دل کو مضبوط کئے بغیر دوسروں کے دل کو اپنی طرف متوجہ اور متاثر نہیں کیا جا سکتا۔"

ڈاکو نے پھر کہا۔ "لیکن دیکھو، جب تک تم رحمدل نہیں بنے، میرا دل بھی راہ پر نہیں آیا۔ لیکن تمہارا مجسم محبت بننا تھا کہ میں تمہارے بس میں آگیا۔ تم نے مجھ پر فتح پائی۔"

موہن مسرور و شاداں، ڈاکو کو ساتھ لے کر ٹنڈوں کے پاس پہنچا۔ دیکھا

کہ جیسا ہوں وا لا ٹنڈ بھی سر سبز ہو گیا ہے۔ موہن کو یقین ہو گیا کہ جس طرح مدھم آگ گھاس کو نہیں جلا سکتی تھی۔ اسی طرح جب تک انسان اپنے دل کو مجسم نور و محبت نہ بنا لے دوسروں کے دلوں کو منور نہیں کر سکتا۔

تینوں ٹنڈ سرسبز ہو کر بار ور درخت بننے پر موہن بے حد خوش ہوا۔ اب اسے روشنی مل چکی تھی، اس کا دل منور ہو چکا تھا ــــــ اس کی ریاضت پوری ہو چکی تھی۔ اس نے ڈاکو کو اپنا چیلہ اور جانشین بنا کر فوراً سمادھی لے لی۔

اب ڈاکو اپنے گورو کے حکم کے مطابق دنیا میں نیکی اور محبت کا پرچار کر کے زندگی بسر کرنے لگا۔

دو حاجی (۲)

ایک گاؤں میں رحیم اور کبیر دو بوڑھے رہتے تھے۔ کبیر دولت مند تھا اور رحیم متوسط الحال۔ انہوں نے بہت دیر سے حج کا ارادہ کر رکھا تھا۔

کبیر دولت مند ہونے کے ساتھ ہی خوش خلق، دلیر اور دھن کا پکا بھی تھا۔ دو بار گاؤں کے چودھری کی حیثیت میں نہایت خوش اسلوبی سے کام کر چکا تھا اس کے دو لڑکے اور ایک پوتا تھا۔ ساٹھ برس کی عمر کے باوجود ڈاڑھی میں سفید بال نہ آئے تھے۔

رحیم طاقتور، رحمدل، اور ملنسار آدمی تھا۔ اس کے بھی دو لڑکے تھے۔ چھوٹا گھر پہ رہتا تھا اور بڑا باہر نوکری پر گیا ہوا تھا۔ رحیم خود گھر پہ ہی بڑھئی کا کام کرتا تھا۔

حج کا ارادہ کئے انہیں بہت دن ہو چکے تھے۔ لیکن کبیر کو فرصت ہی نہ ملتی تھی، ایک کام ختم ہوتا تھا تو دوسرا آگھیرتا تھا۔ پہلے پوتے کا بیاہ کرنا تھا۔ اس سے فارغ ہوا تو چھوٹے لڑکے کی منگنی آگئی۔ اس کے بعد مکان بننا شروع ہو گیا۔

ایک دن باہر ایک شہتیر پر بیٹھ کر دونوں بوڑھے باتیں کرنے لگے۔ رحیم نے پوچھا۔ "کیوں بھائی صاحب! اب حج کا ارادہ کب ہے؟"

"ذرا اور ٹھہرو۔ یہ برس اچھا نہیں رہا۔ میں نے سمجھا تھا' سو روپے میں مکان تیار ہو جائے گا۔ تین سو لگ چکے ہیں اور ہنوز دِلّی دُور است' والا معاملہ ہے۔ آئندہ سال ضرور چلیں گے۔" کبیر نے معذرت کے طور پر کہا۔

رحیم بولا" نیک کام میں دیر کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں تو فوراً چل دینا چاہیئے۔ دن بہت اچھے ہیں۔"

"دن تو اچھے ہیں لیکن مکان کو کس پر چھوڑوں؟"

"کیا کوئی سنبھالنے والا ہی نہیں، بڑے لڑکے کے سپرد کر جاؤ۔"

"اس کا کیا بھروسہ ہے؟"

"لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہارے مرنے پر کون سنبھالے گا؟ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ تمہارے جیتے جی' وہ کام کاج سنبھال لیں اور تم آرام سے خدا کی یاد میں دن گزارو۔"

"یہ تو ٹھیک ہے' لیکن کوئی کام شروع کر کے اسے ختم کرنے کی خواہش انسان میں قدرتی طور پر ہوتی ہے۔"

"کام تو کبھی پورا ہی نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ کسر رہ ہی جاتی ہے۔ کل ہی کی بات ہے کہ عورتیں عید کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ کہیں کپڑے سئے جا رہے تھے' کہیں کچھ چیزیں خریدی جا رہی تھیں اور کہیں سوّیاں بنائی جا رہی تھیں اتنے میں عید آ پہنچی۔ بہو بولی۔ یہ خدا کی بڑی مہربانی ہے کہ تہوار بلائے بغیر ہی آ جاتے ہیں۔ ورنہ ہم تیاری ہی کرتے رہ جائیں۔"

" ایک بات اور ہے۔ اس مکان پر میرا بہت سا روپیہ خرچ ہو گیا ہے۔ اس وقت روپے کی بہت کمی ہے۔ کم از کم سو روپے تو ہوں زادِ سفر کے لئے ورنہ حج کرنا معلوم!"

رحیم نے ہنس کر کہا۔ "جو شخص جتنا امیر ہوتا ہے۔ وہ اتنا ہی مفلس بھی ہوتا ہے۔ تم اور روپے کی فکر؟ ۔۔۔ جانے بھی دو۔ میں سچ کہتا ہوں، کہ اس وقت میرے پاس ایک سو روپیہ بھی نہیں لیکن جب چلنے کا فیصلہ ہو جائیگا تو کہیں نہ کہیں سے روپیہ بھی ضرور آ جائے گا۔ بس یہ بتاؤ! چلنا کب ہے؟"

" بھئی، تم نے روپے جمع کر رکھے ہونگے۔ ورنہ آ کہاں سے جائینگے؟"

" کچھ گھر میں سے، کچھ مال بیچ کر۔ پڑوسی مکان کے لئے چوکھٹ وغیرہ خریدنا چاہتا ہے، اسے سستے داموں دے دوں گا۔"

" لیکن سستی بیچ کر بعد میں پچھتاؤ گے!"

" میں گناہ کے سوا اور کسی بات پر نہیں پچھتایا کرتا۔ روح سے زیادہ عزیز کونسی چیز ہے۔"

" یہ تو ٹھیک ہے لیکن گھر کے کام کاج کو بھولنا بھی اچھا نہیں۔"

" لیکن روح کو بھولنا، روح کا خیال تک نہ کرنا تو اور بھی بُرا ہے جب دل میں کوئی بات ٹھان لو تو اسے پورا کر کے چھوڑنا چاہیئے۔"

(۲)

آخر چلنا ہی طے ہوا۔ چار دن بعد جب روانگی کا وقت آیا تو کبیر بڑے لڑکے کو سمجھانے لگا کہ مکان پر چھت اس طرح ڈالنا، بھوسے کے کُپ اچھی

طرح باندھنا، منڈی میں جاکر اناج اس بھاؤ سے بیچنا، روپے سنبھال کر رکھنا، ایسا نہ ہو کھو جائیں، گھر کا انتظام اس طرح رکھنا کہ کسی قسم کا نقصان نہ ہونے پائے، فصل پر نگاہ رکھنا ——— غرضکہ اس کی نصیحتیں ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔

اس کے برعکس رحیم نے اپنی بیوی سے صرف اسی قدر کہا۔ کہ تم خود ہوشیار اور دانا ہو، سب کام دیکھ بھال کر کرنا۔

رحیم تو خوشی خوشی ہنستا ہوا گھر سے باہر نکلا اور گاؤں چھوڑتے ہی گھر کے تمام بکھیڑے بھول گیا۔ ساتھی کو خوش رکھنا، آرام سے حج کرکے لوٹ آنا اس کا مقصد تھا۔ راہ چلتے ہوئے آہستہ آہستہ قرآن کی آیات پڑھتا۔ یا کوئی نعت گنگناتا اور بزرگانِ دین کے تذکرے کرتا جاتا تھا۔ سڑک پر یا سرائے میں جب کسی سے ملاقات ہوتی بڑی ملائمت سے بات کرتا۔

کبیر بھی خاموشی سے چل تو رہا تھا۔ لیکن اس کا دل بے چین تھا۔ طرح طرح کے خیالات و افکار کا مرکز بنا ہوا تھا ——— لڑکا انجان ہے، نہ جانے کیا کر بیٹھے ؟ فلاں بات کہنا بھول گیا۔ دیکھیں مکان کی چھت پڑتی ہے یا نہیں ؟ ——— ہر وقت ایسے ہی خیالات اسے گھیرے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی وہ لوٹ جانے پر تیار ہو جاتا تھا۔

(۳)

چلتے چلتے ایک ماہ کے بعد وہ ایک پہاڑی علاقہ میں پہنچ گئے۔ پہاڑی

لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ اب تک یہ راستے ہیں پیسے خرچ کر کے کھانا کھاتے آئے تھے، اب ان کی بڑی خاطر تواضع ہونے لگی۔

اس کے بعد وہ ایسے ملک میں پہنچے۔ جہاں سخت قحط پڑا ہوا تھا۔ سب کھیتیاں خشک ہو گئی تھیں۔ اناج کا ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ دولت مند غریب ہو گئے تھے اور غریب آدمی ملک چھوڑ کر پیٹ بھرنے کے لئے دوسرے علاقوں میں چلے گئے تھے۔ یہاں انہیں بڑی تکلیف ہوئی اناج بہت کم ملتا تھا اور وہ بھی بہت گراں۔

رات کو انھوں نے ایک جگہ آرام کیا۔ دوسرے دن چلتے چلتے ایک گاؤں آیا۔ گاؤں کے باہر ایک جھونپڑا تھا۔ رحیم بہت تھک گیا تھا بولا "مجھے پیاس لگ رہی ہے تم چلو، میں اس جھونپڑے سے پانی پی کر ابھی تمہیں آملتا ہوں۔"

کبیر نے کہا "بہت اچھا، پی آؤ۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوں۔"

جھونپڑے کے پاس جا کر رحیم نے دیکھا کہ اس کے سامنے دھوپ میں ایک انسان پڑا ہے۔ رحیم نے اس سے پانی مانگا۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا وہ سمجھا، شاید کوئی بیمار ہے۔

نزدیک جانے پر جھونپڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ کواڑ کھلے تھے وہ اندر چلا گیا۔

(۴)

رحیم نے دیکھا ـــــ ایک بڑھیا چادر اوڑھے زمین پر بیٹھی ہے، پاس

ہی ایک بچہ بیٹھا "روٹی روٹی" چلاّ رہا ہے، چولھے کے پاس ایک عورت پڑی تڑپ رہی ہے، اس کی آنکھیں بند ہیں اور گلا رو ندھا ہوُا ہے۔

رحیمؔ کو دیکھ کر بڑھیا نے پوچھا۔ "تم کون ہو، کیا کوئی فقیر ہو؟ اس وقت تو ہمارے پاس کچھ نہیں۔"

رحیمؔ نے کہا۔ "مجھے پیاس لگی ہے، پانی مانگتا ہوں۔"

بڑھیا نے کہا۔ "یہاں نہ کوئی برتن ہے نہ لانے والا، یہاں کچھ بھی نہیں۔ جاؤ اپنی راہ لو۔"

رحیمؔ نے پوچھا۔ "کیا تم میں سے کوئی اس عورت کی مدد نہیں کر سکتا؟"

بڑھیا نے کہا۔ "نہیں، کوئی نہیں۔ باہر میرا لڑکا بھوک سے مر رہا ہے اور یہاں ہم سب!"

اتنے میں باہر سے وہ آدمی بھی گرتا پڑتا اندر آیا اور بولا۔ "قحط اور بیماری دونوں نے ہمیں مار ڈالا ہے۔ یہ بچہ بھی کئی دن سے بھوکا ہے۔"

یہ کہکر وُہ رونے لگا اور اس کی ہچکی بندھ گئی۔ رحیمؔ نے فوراً اپنے تھیلے سے روٹی نکال کر ان کے آگے رکھدی۔

بڑھیا بولی "سب کے حلق خشک ہیں، پہلے باہر سے پانی لے آؤ۔"

رحیمؔ بڑھیا سے کوئیں کا پتہ پوچھ کر پانی لے آیا۔ سب نے روٹی کھا کر پانی پیا لیکن چولھے کے پاس والی عورت پڑی تڑپتی رہی۔ رحیمؔ گاؤں سے کچھ دال اور چاول لے آیا اور کھچڑی پکا کر سب کو کھلائی۔

---

(۵)

بڑھیا نے کہا۔" بھائی کیا سناؤں، غریب تو ہم پہلے ہی تھے، اس پر قحط پڑ گیا، ہماری حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ شروع شروع میں تو ہمسائے اناج ادھار دیتے رہے لیکن آخر وہ خود بھی بھوکوں مرنے لگے، ہمیں کہاں سے دیتے ؟"

اس آدمی نے کہا۔" میں نوکری کی تلاش میں نکلا، دو تین دن تو کچھ ملا لیکن پھر کسی نے کوئی کام نہ دیا۔ بڑھیا اور لڑکی بھیک مانگنے لگیں۔ اناج کا قحط تھا، کوئی بھیک بھی نہ دیتا تھا۔ بہتیری کوشش کی، ہاتھ پاؤں مارے، لیکن کچھ نہ بن سکا، بھوک کے مارے گھاس کھانے لگے، اسی کے سبب میری بیوی چولھے کے پاس پڑی تڑپ رہی ہے۔"

بڑھیا پھر بولی۔" پہلے کچھ دن تو میں چل پھر کر کام دھندا کرتی رہی، لیکن کہاں تک ؟ بھوک اور بیماری نے جان لے لی۔ جو کچھ ہمارا احال ہے وہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔"

ان کی داستان سن کر رحیم نے خیال کیا کہ آج رات یہیں رہنا چاہیئے۔ کل اپنے ساتھی سے جا ملوں گا۔

صبح اٹھ کر وہ گاؤں گیا اور کھانے پینے کی جنس لے آیا ــــ اور ان کے پاس ٹھہر کر اس طرح کام کرنے لگا، جیسے اس کا اپنا ہی گھر ہو۔ دو تین دن کے بعد وہ سب چلنے پھرنے لگے ــــ اور وہ عورت بھی اٹھ بیٹھی۔

(۹)

چوتھے دن رحیم نے سوچا کہ کل صبح میں آگے چل دوں گا۔ یہ سوچ کر اس نے بچھڑا اور اناج وغیرہ لاکر انہیں دیا اور خود نماز پڑھنے کے لئے چلا گیا۔

ان لوگوں نے اپنی زمین ایک سرمایہ دار کے پاس گروی رکھ کر قحط کے اس زمانے میں کچھ دن کاٹے تھے۔ وہ نوجوان اس سرمایہ دار کے پاس گیا اور گڑگڑاکر کہا کہ اس وقت روپیہ دے کر زمین چھڑانا تو میرے اختیار سے باہر ہے، اگر آپ اس سہ ماہی میں مجھے کھیت بونے کی اجازت دے دیں تو محنت مشقت کر کے آپ کا قرض ادا کر دوں۔ لیکن وہ کب ماننے والا تھا۔ اس نے صاف جواب دے دیا کہ روپیے کے بغیر تم کھیت نہیں بو سکتے، جاؤ اپنا کام کرو۔

وہ مایوس ہو کر گھر لوٹ آیا۔ اتنے میں رحیم بھی آگیا۔ زمیندار کی بات سن کر وہ دل میں سوچنے لگا کہ جب زمیندار انہیں کھیت نہیں بونے دیتا تو آور ان کی مدد کیا کریگا؟ اگر میں انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا تو یہ سب لقمۂ اجل ہو جائیں گے۔ اچھا کل نہیں، پرسوں جاؤنگا۔

اب رحیم بڑی کشمکش میں مبتلا تھا، نہ رہتے بنتی تھی اور نہ جاتے ہی! رات کو پڑا پڑا سوچنے لگا —— یہ تو اچھا بکھیڑا سر آپڑا، پہلے اناج پانی اب کھیت چھڑانا، پھر گائے بیلوں کی جوڑی مول لینا: یہ تم کس جنجال میں پھنس گئے؟

جی چاہتا تھا، وہ انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر چلا جائے لیکن رحم اور ہمدردیٔ انسانی اسے جانے نہ دیتی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ خواب میں دیکھا کہ وہ جانا چاہتا ہے، لیکن کسی نے اس کی چادر پکڑ لی ہے، مڑ کر دیکھا تو بچہ روٹی مانگ رہا ہے۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا اور دل ہی دل میں کہنے لگا ــــ نہیں، اب میں نہیں جاؤں گا، یہ خواب مجھے سبق دیتا ہے کہ مجھے ان کا کھیت چھڑا کر، گائے بیل خرید کر اور سب انتظام کر کے جانا چاہیئے۔

صبح اٹھ کر وہ زمیندار کے پاس گیا۔ اور روپے دے کر ان کا کھیت چھڑا دیا۔ پھر ایک کسان سے ایک گائے اور دو بیل لے کر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں عورتوں کو باتیں کرتے سنا ــــ

"بہن، پہلے تو ہم اسے معمولی انسان سمجھتے تھے، صرف پانی پینے آیا تھا لیکن اب سنا ہے کہ کھیت چھڑانے اور گائے بیل خریدنے گیا ہے۔ ایسے خدا رسیدہ بزرگ کی تو زیارت کرنی چاہیئے۔"

رحیم اپنی تعریف سن کر وہاں سے آگے نکل گیا۔ جب وہ گائے اور بیل لے کر جھونپڑے پر پہنچا تو نوجوان کسان نے پوچھا:۔

"میرے محسن! یہ کہاں سے لائے؟"

رحیم نے کہا۔ "ایک کسان سے بڑے سستے مل گئے ہیں۔ جاؤ انہیں باندھ کر بھوسہ وغیرہ ان کے آگے ڈالو۔"

اسی رات جب سب نیند کی آغوش میں محو آرام ہو گئے تو رحیم چپکے

سے اٹھ کر گھر سے باہر نکلا اور عرب کی راہ لی۔

(۷)

تین میل چل کر ایک درخت کے نیچے اس نے بٹوا نکال کر روپے گنے تو بہت ہی تھوڑی رقم رہ گئی تھی۔ اس نے سوچا :-
ان روپوں سے بیت اللہ (کعبہ) پہنچنا غیر ممکن ہے ـــــ بھیک مانگنا گناہ ہے اور بھیک مانگ کر حج کرنے کا ثواب بھی کیا ؟ اب اس زندگی میں تو حج کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اچھا، جیسے خدا کی رضا، وہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ مجھ ایسے گناہگاروں کو بھی بخش ہی دیگا۔
یہ سوچکر، وہ گاؤں کا چکر کاٹ کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔
گھر پہنچنے پر گھر والے بڑے حیران ہوئے اور پوچھنے لگے کہ واپس کیوں آ گئے ؟ رحیم نے یہی جواب دیا کہ کبیر کا ساتھ چھوٹ گیا اور روپے چوری ہو گئے ناچار واپس آنا پڑا۔
رحیم کے واپس آنے کی خبر سن کر کبیر کے گھر والے اس سے پوچھنے لگے کہ اسے کہاں چھوڑا ؟ اُس نے انہیں بھی یہی کہا۔ کہ نصف راہ میں میں اس سے بچھڑ گیا اور روپے چوری ہو گئے۔ مکہ پہنچنا ممکن نہ تھا اس لئے واپس ہی لوٹنا پڑا۔"
سب لوگ رحیم کی عقل پر ہنسنے لگے کہ چلا تھا حج کرنے راستے ہی میں روپے کھو کر آ گیا ـــــ

(۸)

اب ادھر کا حال سُنیئے ــــــــ

رحیم پانی پینے چلا گیا تو کبیر تھوڑی دُور جا کر ایک جگہ بیٹھ گیا، اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ شام ہوگئی لیکن وہ نہ آیا۔

کبیر سوچنے لگا ــــــ وہ آیا کیوں نہیں؛ میری آنکھ لگ گئی تھی کہیں آگے تو نہیں نکل گیا؛ لیکن یہاں سے گزرتا تو مجھے نہ دیکھتا؛ اگر واپس جا کر دیکھوں تو شاید وہ آگے نکل گیا ہو، پھر تو ملنا ہی ناممکن ہو گا، آگے ہی چلو، منزل پر پہنچ کر پتہ لگ جائے گا۔

چنانچہ وُہ اکیلا ہی آگے روانہ ہوا۔ راستے میں کئی مسافروں سے رحیم کا حلیہ بیان کر کے اس کے متعلق دریافت کیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا ــــــ اگلی منزل پر بھی نہ ملا۔ اس نے سوچا، شاید اس سے اگلی منزل پر ملاقات ہو جائے۔ راستے میں اسے ایک اور حاجی مل گیا ــــــ وہ دونوں اکٹھے سفر طے کرنے لگے اور ۷۔ ذی الحجہ کو مکہ معظمہ جا پہنچے۔

مکہ معظمہ پہنچ کر کبیر نے رحیم کا حال معلوم کرنے کی پوری کوشش کی لیکن کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

آٹھ تاریخ کو ایک مسافر نے جو ان کے قریب ہی اقامت گزیں تھا کہا کہ میرا بٹوہ کہیں کھو گیا ہے۔

(۹)

کبیر نے دل میں کہا ــــــ ہے تو بیچارہ بھک منگا سا، اس کے پاس روپیہ کہاں سے آیا یقیناً جھوٹ بولتا ہے ــــــ

لیکن فوراً ہی اس نے سوچا کہ کسی شخص کے بارے میں ایسا تصور کرنا گناہ ہے۔ اس لئے دل کو بہتیرا سمجھایا لیکن اس کا دھیان اسی طرف رہا مقدس مقام پر آنے کے باوجود دل کا غبار نہ دُھل سکا۔ وہ تمام دن ایسے ہی وسوسوں کا شکار رہا۔ نماز بھی دلجمعی سے ادا نہ کر سکا۔

۹ ر ذی الحجہ کو فرائض حج ادا کرتے وقت کبیر نے دیکھا کہ رحیم بھی حاجیوں میں شامل ہے اور وہ سنگ اسود کے قریب پہنچ کر اسے ہاتھ سے چھو رہا ہے۔ وہ حیران سا رہ گیا کہ یہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟ میں تو تمام راہ ڈھونڈتا آیا ہوں۔ اس نے آنکھیں مل کر دیکھا ———— یقیناً رحیم ہی تھا۔ اتنے میں وہ ہجوم میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صفا اور مروہ کے درمیان پھر اس نے رحیم کو دیکھا۔ وہ اس سے کافی دور تھا، اس لئے اس سے ملنا دشوار تھا۔ تاہم اس نے دل میں کہا ———— اچھا ہی ہوا، ساتھی مل گیا۔

مراسم حج سے فارغ ہو کر وہ اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹا۔ لیکن اس کا ہاتھ بٹوے پر تھا کہ کوئی چرا نہ لے یا گر نہ پڑے۔ اب اس نے رحیم کو ڈھونڈنا شروع کیا لیکن وہ کہیں نہ مل سکا۔

حج کے بعد اس نے زیارت مدینہ کا ارادہ کیا اور ایک قافلے کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ یہاں بھی اسے رحیم کا چہرہ دکھائی دیا۔ لیکن جیسے ہی وہ اسکی طرف لپکا۔ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ مسجد نبوی کے دروازے میں کھڑا ہو گیا کہ باہر نکلتے وقت تو ملے گا ہی۔ سب آدمی نکل گئے لیکن رحیم نہ ملا۔

دو دن مدینہ منورہ رہ کر وہ واپس روانہ ہوا۔

(۱۰)

واپسی میں راہ چلتے وقت کبیر کے دل میں گھر کے وہی بکھیڑے بار بار آنے لگے۔ چھ مہینے بہت ہوتے ہیں، اتنے دنوں میں نہ جانے گھر کی کیا حالت ہوئی ہو۔ کہاوت ہے کہ " بناتے لگے چھ ماہ اور پل میں ہوا جاڑ " کون جانے لڑکوں نے کیا کیا ہو، فصل کیسی ہوئی ہو گی ؟ جانوروں کی دیکھ بھال بھی کسی نے کی ہے یا نہیں ؟

چلتے چلتے جب کبیر اس جھونپڑے کے پاس پہنچا۔ جہاں رحیم پانی پینے گیا تھا تو اندر سے ایک لڑکی نے آکر اس کا دامن پکڑ لیا اور کہا " بابا ذرا اندر چلو ! "

کبیر دامن چھڑا کر جانا چاہتا تھا کہ اندر سے ایک اور عورت بولی۔

" بھائی صاحب ! کھانا کھا کر رات یہیں آرام کیجئے، صبح چلے جانا "

وہ اندر چلا گیا اور سوچنے لگا ——— رحیم یہیں پانی پینے آیا تھا شاید ان سے اس کا پتہ لگ سکے۔

عورت نے اس کا ہاتھ منہ دھلا کر اسے کھانا کھلایا اور پھر بولی :-

" حاجی صاحب ! ہم مہمانوں کی خدمت کرنا کیا جانیں، یہ سب کچھ ہمیں ایک مسافر نے سکھایا ہے۔ ہم خدا کو بھول گئے تھے۔ ہماری یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ بوڑھا مسافر نہ آتا تو ہم سب کے سب مر گئے ہوتے۔ وہ یہاں پانی پینے آیا تھا، ہمارا حال زار دیکھ کر یہیں ٹھہر گیا۔ ہمارا کھیت رہن پڑا

تھا، وہ چھڑا دیا، گائے بیل مول لے دیئے اور سب سامان فراہم کر کے ایک دن نہ جانے کہاں چلا گیا۔"

اتنے میں بڑھیا آ گئی اور بولی :-

"وہ انسان نہیں، فرشتہ تھا۔ اس نے ہم پر رحم کیا، ہماری حالت سدھاری، ہمیں نئی زندگی بخشی، ورنہ ہم سب مر گئے ہوتے۔ وہ پانی پینے آیا تھا اور میں نے کہا تھا، جاؤ یہاں پانی نہیں، جب یہ بات یاد آتی ہے تو میں کانپ جاتی ہوں۔"

چھوٹی بچی بھی اس کی تعریف کرنے لگی، غرض سب اس کی نیکی، اسکی ہمدردی کے گن گانے لگے۔ رات کو کسان آیا تو وہ بھی رحیم ہی کی تعریفیں کرنے لگا ——— "یقیناً اس مسافر نے ہمیں پھر سے زندگی بخشی، ہمیں معلوم ہو گیا کہ خدا کیا ہے اور احسان کسے کہتے ہیں۔ وہ ہمیں حیوانوں سے انسان بنا گیا۔"

اب کبیر سمجھا کہ مکہ اور مدینہ میں رحیم کے دکھائی دینے کی وجہ کیا تھی اسے یقین ہو گیا کہ رحیم کا حج قبول ہو گیا ہے۔

دوسرے دن وہ وہاں سے چل دیا۔

(۱۱)

جب وہ گھر پہنچا تو دیکھا کہ لڑکا شراب پی کر مست پڑا ہے۔ وہ لڑکے کو ڈانٹنے پھٹکارنے لگا۔ لڑکے نے کہا۔ "تو حج کو جانے کے لئے کس نے کہا تھا، نہ جاتے!"

کبیر نے غصّے سے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔۔۔۔

دوسرے دن کبیر جب گاؤں کے چودھری سے ملنے جا رہا تھا تو راستے میں رحیم کی بیوی مل گئی۔ اس نے پوچھا۔ "بھائی جی خیریت سے تو ہو؟ حج کر آئے؟"

"ہاں، حج تو بخیر و خوبی ہو گیا" کبیر نے کہا "رحیم بھائی راستے میں مجھ سے بچھڑ گئے تھے، کہو، خیریت سے تو گھر پہنچ گئے؟"

"انہیں آئے تو کئی مہینے ہو گئے۔"

"اس وقت گھر میں ہیں یا کہیں باہر گئے ہیں؟"

"نہیں، گھر ہی میں ہیں!"

کبیر گھر کے اندر چلا گیا اور رحیم سے بولا۔ "السلام علیکم رحیم بھیّا!"

"وعلیکم السلام، کہو، کبیر بھائی حج کر آئے؟"

"ہاں حج بھی کر آیا اور روضہ مبارک کی زیارت بھی، لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ حج قبول بھی ہوا یا نہیں، واپسی پر میں اس جھونپڑے میں ٹھہرا تھا جہاں تم پانی پینے گئے تھے۔"

رحیم نے بات ٹال دی اور کبیر بھی خاموش ہو گیا لیکن اسے پختہ یقین ہو گیا کہ حج اکبر یہی ہے کہ انسان زندگی بھر انسانوں کے ساتھ محبت سے رہے اور ہمیشہ بھلائی کے کاموں پر کمربستہ رہے ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است

دو گز زمین (۲)

ایک دن کملا اپنی چھوٹی بہن منورما سے ملنے گاؤں میں آئی۔ کملا کی شادی بمبئی کے ایک سرمایہ دار سوداگر سے ہوئی تھی اور منورما کی گجرات (کاٹھیاواڑ) کے ایک متوسط الحال کسان سے۔

شام کو جب دونوں بہنیں کھانا کھانے بیٹھیں تو کملا نے کہا "منورما بہن! مجھے تو گاؤں میں رہنا پڑے تو دو ہی دن میں جی اُکتا جائے۔ تم نہ جانے کیوں کر یہاں رہتی ہو! دیکھو ہم شہر میں کیسے اچھے لباس پہنتے ہیں، قسم قسم کے لذیذ و پُر تکلف کھانے کھاتے ہیں، تھیئٹر اور سینما دیکھتے ہیں باغوں کی سیر کرتے ہیں اور خوب رنگ رلیاں مناتے ہیں۔"

منورما نے بڑے فخر و ناز سے کہا "تجھ سے کہتی ہو بہن تو کبھی تمہارے ساتھ جگہوں کا تبادلہ نہ کروں۔ مانا کہ ہم معمولی کھانا کھاتے ہیں، لیکن ہمیں رات دن فکر تو نہیں گھیرے رہتی، تمہیں تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی فکر لگی رہتی ہے۔ نفع و نقصان تو اعم بھائی ہیں، جو آج راجہ ہے کل کنگال ۔۔۔ اس کے خلاف یہاں تو ہمیشہ ایک سا سے ہی رہتے ہیں۔ کسان دولتمند نہیں بن سکتے۔ لیکن کھانے پہننے کی تو انہیں کمی ہو ہی نہیں سکتی۔"

کملا بولی "کھانے کی بھی ایک ہی کہی۔ تم تو جانور رہو، شہریت اور تہذیب

وتمدن کو کیا جانو! کتنا ہی جان کھپاؤ، تمہاری اولاد ایک دن اسی کھاد کے
ڈھیر پر جان دے دیگی اور بس!"

منورما نے کہا۔" اس سے کیا؟ مرنا تو ایک دن سب کو ہے، زراعت کا
کام مشکل سہی، لیکن ہمیں کسی کا خوف تو نہیں، نہ کسی کے آگے سر جھکانا پڑتا
ہے۔ شہر میں تو ہمیشہ دل بے چین رہتا ہے، ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا ہے
کیا پتہ کل تمہارا شوہر شراب کا عادی ہو کر بازاری عورتوں کے پاس جانے لگے
ایسی باتیں آئے دن سننے میں آیا کرتی ہیں۔"

رتن چند چار پائی پر لیٹا یہ باتیں سن رہا تھا، دل میں سوچنے لگا ــــ
"میری بیوی کہتی تو سچ ہے۔ ہم بچپن ہی سے کھیتی باڑی کا کام کرنے لگتے
ہیں اور ہمیں برے کاموں کا خیال تک نہیں آتا، لیکن افسوس کی بات تو یہ
ہے کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ــــ ایک کھیت بھی تو اپنا نہیں، اگر میرے
پاس اپنی زمین ہو تو پھر چاندی ہی چاندی ہے۔"

مقدر کی بات ہے، شیطان بھی وہاں بیٹھا یہ باتیں سن رہا تھا۔ رتن چند
کے دل میں زمین کا لالچ پیدا ہوتے دیکھ کر خوش ہو گیا اور دل میں کہنے لگا
ــــ "اسی لالچ کے زور سے ایک دن اسے تباہ و برباد کروں گا۔"

(۲)

اس گاؤں کے قریب ہی ایک زمیندارنی رہتی تھی۔ جس کے پاس
تین سو بیگھے زمین تھی۔ اس نے ایک بوڑھے ریٹائرڈ سپاہی کو مختار عام
بنا رکھا تھا۔ یہ کارندہ آسامیوں کو بے حد تنگ کیا کرتا تھا۔ رتن چند

اگرچہ اپنے مال مویشی کی نگرانی کرتا رہتا تھا، پھر بھی وہ کبھی کبھی زمیندارنی کے کھیتوں میں چلے ہی جاتے تھے۔ اس بات پر کئی بار اس کی کارندے سے لڑائی بھی ہو چکی تھی۔ جس سے رتن چند بڑا دکھی ہو گیا تھا۔

چند دن بعد یہ خبر پھیلی کہ بوڑھی زمیندارنی اپنی ریاست بیچ رہی ہے اور گاؤں کا بنیا اسے خریدنے کی تیاری کر رہا ہے۔ گاؤں والے بڑے خوفزدہ ہوئے کہ اگر بنیا مالک بن گیا تو اس کے سپاہی بوڑھے کارندے سے بھی زیادہ تکلیف دیں گے۔ــــــــ مناسب یہ ہے کہ سب مل کر ریاست خرید لیں۔ لیکن شیطان نے ان میں ایسی پھوٹ ڈالی کہ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ سب لوگ اپنے اپنے نام سے زمین کے علیحدہ علیحدہ ٹکڑے خریدیں۔ بوڑھی زمیندارنی اس پر بھی رضامند ہو گئی۔ ایک کسان نے اس شرط پر پچاس بیگھے زمین خریدی کہ نصف قیمت تو ابھی ادا کر دے گا اور نصف ایک سال بعد۔

یہ سنکر رتن چند کے دل میں بھی رشک پیدا ہوا۔ اس نے سوچا کہ کچھ بھی ہو کم از کم چالیس بیگھے زمین تو مجھے بھی ضرور خریدنا چاہیئے۔ سو روپے گھر میں جمع تھے، باقی کچھ اناج اور ایک بیل بیچ کر اس نے چالیس بیگھے زمین کی نصف قیمت ادا کر دی اور نصف قیمت دو سال کے اندر بالاقساط دینے کا اقرار کیا۔

رتن چند بڑا محنتی آدمی تھا، خوب دل لگا کر کھیت جوتنے بونے فصل اچھی ہونے لگی اور دو برس کے اندر اندر اس نے زمین کی تمام قیمت ادا

کر دی۔ اب وہ اپنے کھیتوں، جانوروں، اناج اور بھوسے کے ڈھیروں کو دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ یہ کھیت پہلے بھی وہاں موجود تھے اور رتن چند روزانہ دیکھا کرتا تھا۔ لیکن اب اپنی ملکیت ہو جانے کے باعث انہیں دیکھنے میں اور ہی مسرت و راحت کا احساس ہوتا تھا۔

(۳)

اب رتن چند کسان نہیں، زمیندار تھا، اس کے دن بڑے آرام سے گزر سکتے تھے لیکن ہمسائے بڑا دکھ دینے لگے۔ کبھی کوئی اس کے کھیت میں بیل چھوڑ دیتا۔ کبھی گاؤں کے لڑکے چارے کے کھیت میں جانوروں کو چرانے لگتے۔ شروع شروع میں تو وہ برداشت کرتا رہا، آخر کہاں تک؟ اس نے سوچا کہ اس طرح خاموش رہوں گا تو یہ لوگ چین نہ لینے دیں گے۔ آخر اس نے نالش کر کے کئی آدمیوں کو جرمانہ کروا دیا۔ لوگ جھلا کر اور بھی ستانے لگے۔

ایک دن رامو نے اس کی زمین کے تمام درخت کاٹ ڈالے۔ اس نے صبح جا کر یہ حال دیکھا تو آگ بگولا ہو گیا کہ یہ کس شیطان کی شرارت ہے۔ ایک آدھ درخت کاٹ ڈالتا تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ لیکن کمبخت نے ایک بھی تو درخت باقی نہیں رہنے دیا۔ ہو نہ ہو یہ کارستانی رامو ہی کی ہے۔

وہ غصے میں بھرا ہوا رامو کے مکان پر پہنچا اور بولا "او رامو! تو نے درخت کیوں کاٹے ہیں؟"

رامو لڑنے مرنے پر اُتر آیا ـــــ "کیسے درخت؟ کس نے کاٹے ہیں؟ بھاگ جاؤ نظر آؤ یہاں سے ورنہ ابھی سر پھوڑ دوں گا۔"

رتن چند بھلا یہ باتیں کب سن سکتا تھا، فوراً کچہری جا کر نالش داغ دی۔ فیصلے میں رامو صاف بری ہو گیا۔ موقعہ واردات کا کوئی گواہ ہی نہ تھا۔ رتن چند جل بھن کر جا کموں کو گالیاں دینے لگا۔ کہ یہ چوروں کو چھوڑ دیتے ہیں ـــــ سب چور اکٹھے ہوئے ہیں۔

قصہ کوتاہ، اب کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جب ہمسایوں سے اس کا لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ پہلے جب ایک بسوہ زمین بھی ذاتی نہ تھی، وہ بڑا خوش تھا، بڑے آرام میں تھا، لیکن اب غم و آلام نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے!

انہی دنوں گاؤں میں ہوائی اُڑی کہ لوگ گھر بار چھوڑ کر کسی نئے علاقے میں جانے کی سوچ رہے ہیں۔ رتن چند بہت خوش ہوا کہ اجاڑ ہو جانے پر بہت سی زمین مل جائے گی اور میں راحت و آرام سے بسر کروں گا!

ایک دن رتن چند کے گھر میں ایک مہمان آیا۔ رتن چند نے اس کی بڑی خاطر تواضع کی، رات کو کھانا کھاتے وقت مہمان بولا۔ "سرکار نے پنجاب میں ایک نئی بستی بسائی ہے۔ ایک شخص کو ۲۵ بیگھے زمین ملتی ہے زمین بڑی زرخیز ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، ایک آدمی خالی ہاتھ وہاں آیا تھا، دو برس کے اندر ہی اندر مالا مال ہو گیا ہے۔"

یہ سنکر رتن چند کے سر پر لالچ کا بھوت سوار ہوا کہنے لگا۔ "میں اس

اندھیر نگری میں کیوں ٹھوکریں کھاؤں، گھر بار بیچ کر اس نئی بستی میں کیوں نہ چلا جاؤں؟ یہاں تو ہمسایوں نے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے ——— لیکن پہلے جاکر دیکھ آؤں۔"

ان دنوں ریل نہ تھی۔ بہزار دِقّت سینکڑوں میل پیدل چل کر وہاں پہنچا، دیکھا کہ مہمان نے واقعی سچ کہا تھا۔ فی آدمی ۱۲۵ بیگھے زمین ملی ہوئی ہے۔ اگر کوئی چاہے تو ایک روپیہ بیگھے کے حساب سے اور زمین بھی لے سکتا ہے۔

بس پھر کیا تھا سب دیکھ بھال کر کے فوراً گھر لوٹ آیا اور زمین، مویشی وغیرہ سب فروخت کر کے نئی بستی کو چل دیا ——— ہائے رے لالچ!!

(۴)

رتن چند کنبے سمیت نئی آبادی میں پہنچا۔ چودھریوں سے دوستی گانٹھ کر سوا سو بیگھ زمین لے لی اور مکان وغیرہ بنا کر وہاں رہنے لگا۔

اس آبادی میں یہ دستور تھا کہ ایک کھیت کو متواتر دو سال بو تنے بونے کے بعد ایک فصل خالی چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ زمین کی طاقت کم نہ ہو۔ ابتدا میں تو رتن چند آرام سے اپنا کام کرتا رہا۔ لیکن لالچ گناہ کی جڑ ہے۔ ——— اب اسے سوا سو بیگھ زمین بھی کم معلوم ہونے لگی۔ وہ چاہتا تھا کہ ساری زمین میں گیہوں بوئے، کوئی حصہ خالی نہ رہے۔ اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ پنچایت سے الگ زمین لے کر کھیتی باڑی کر کے دولت جمع کر رہے

ہیں، اس لئے وہ متفکر سا رہنے لگا۔

آخر وہ دوسروں سے بھی کھیت لے کر بٹائی پر کھیتی کرنے لگا۔ اگرچہ بڑی دولت اکٹھی ہو چکی تھی لیکن اس کا لالچ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ تیسرے برس عین اس وقت جب بٹائی والی زمین میں گیہوں کی فصل کٹائی کے لئے تیار ہو چکی تھی، مالکوں نے اپنی زمین واپس لے لی۔ رتن چند کو دلی صدمہ پہنچا۔ کہنے لگا اگر یہ زمین میری اپنی ہوتی تو آج مجھ سے یہ سلوک نہ ہوتا۔

دوسرے دن اس نے سنا کہ اس کا ایک ہمسایہ تیرہ سو بیگھہ زمین ڈیڑھ ہزار روپے میں فروخت کرتا ہے۔ رتن چند اس سے سودا طے کر ہی رہا تھا کہ اس کا ایک واقف وہاں آ گیا۔ اس نے رتن چند سے کہا ”تم بالکل گاؤدی ہو! ڈیڑھ ہزار روپے میں صرف تیرہ سو بیگھہ زمین لے رہے ہو تم راجپوتانے میں کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہاں زمین بڑی سستی ہے۔ میں نے وہاں ایک ہزار روپے میں ڈیڑھ ہزار بیگھہ زمین خریدی ہے۔ وہاں کا راجہ بڑا سیدھا سادہ ہے، وہاں جا کر اسے ذرا خوش کر دو اور جتنی زمین چاہو لے لو!“

رتن چند نے اس کا مشورہ مان لیا اور اس گاؤں میں زمین لینے کا خیال چھوڑ دیا۔

(۵)

دوسرے دن رتن چند ایک نوکر کو ہمراہ لیکر اور ایک ہزار روپے پلّے باندھ کر راجپوتانے کو چل دیا۔ بڑی دقّتوں کے بعد اس نے وہاں پہنچ کر دیکھا

کہ سب لوگ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں، نہ کوئی زمین بوتا ہے۔ گائیں، بھینسیں اور گھوڑے وغیرہ چراگاہوں میں چرتے پھرتے ہیں، عورتیں دودھ دُوہ کر دہی اور مکھن بنا لیتی ہیں۔ یہی ان کی خوراک ہے۔ سب لوگ ہنستے کھیلتے، گاتے بجاتے، عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کہیں کوئی جھگڑا ہے نہ لڑائی، اگرچہ سب کے سب جاہل اور نیم وحشی سے ہیں لیکن فریب دریا کا نام نہیں۔

رتن چند کو دیکھ کر وُہ لوگ بڑے خوش ہوئے، اُسے اپنے جھونپڑوں میں لے گئے۔ رتن چند نے کچھ چیزیں انہیں تحفہ کے طور پر دیں۔

اُنہوں نے تحفے لے کر کہا۔" یہاں کا رواج ہے کہ کوئی شخص ہمیں کسی قسم کا تحفہ دے تو اس کے معاوضے میں ہم بھی ضرور کچھ نہ کچھ دیتے ہیں، اسلئے آپ بتائیں کہ آپ کو کیا چاہیئے "

رتن چند نے کہا" مجھے تو زمین کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں آبادی بڑھ جانے کے باعث زمین نے اناج پیدا کرنا بند کر دیا ہے — تمہارے یہاں کی زمین اچھی معلوم ہوتی ہے"

لوگوں نے ہنس کر جواب دیا" یہ کون سی بڑی بات ہے، جتنی زمین جی چاہے لے لو، لیکن ہم اپنے راجہ سے پوچھ لیں۔"

(۶)

اتنے میں راجہ بھی وہاں آنکلا۔ یہ باتیں سن کر رتن چند سے کہنے لگا۔

" جتنی زمین چاہو لے لو!"

رتن چند نے کہا۔" میں ہمیشہ آپکا احسان مند رہوں گا۔ مجھے بہت زیادہ زمین نہیں چاہیئے، البتہ زمین ناپ کر اس کا پٹہ لکھ دیجیئے۔ مرنا جینا تو بنا ہی ہوا ہے، زندگی کا کیا بھروسہ، نوشت و خواند کے بغیر سودا ٹھیک نہیں ہوتا۔ آج آپ دے دیں، کل اگر آپکی اولاد ہم سے چھین لے تو کیا کیا جا سکتا ہے ؟"

راجہ نے کہا۔" بہتر، زمین ناپ لو پٹہ لکھ دیں گے !"

" قیمت کیا ہوگی ؟"

" ہم تو ایک بات جانتے ہیں ، ایک دن کے ایک ہزار روپے !"

رتن چند نے حیران ہو کر پوچھا۔" ایک دن کا کیا حساب ہے ، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا"

راجہ نے کہا۔" بھائی صاحب ! بیگھہ و گھہ ہم کچھ نہیں جانتے ہم تو ایک دن کے ایک ہزار روپے لیتے ہیں ، طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک کوئی شخص جتنا چکّر ـــــ کاٹ لے ، اتنی ہی زمین اس کی ہو جاتی ہے "

رتن چند بولا ـــــ" کیا واقعی ! ایک دن میں تو انسان بہت بڑا چکّر کاٹ سکتا ہے "

راجہ نے کہا " لیکن ایک بات ہے کہ جہاں سے چلو گے ، سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے تمہیں وہیں آنا پڑے گا !"

" ہاں تو چکّر کا نشان کون لگائے گا ؟"

" تم ایک کدال لے جانا اور نشان لگاتے جانا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ جہاں سے چلو سورج غروب ہونے سے پہلے وہیں آ جاؤ !"

رتن چند نے خوشی سے یہ شرط منظور کر لی !

(۷)

رتن چند کو اس خوشی میں رات بھر نیند نہ آئی۔ وہ یہی سوچتا رہا کہ میں پینتیس میل کا چکر نہایت آسانی سے لگا سکتا ہوں۔ اوہ ! پینتیس میل پھر تو میں بڑا جاگیر دار بن جاؤنگا۔ خوش قسمتی سے آج کل دن بھی طویل ہوتے ہیں — پینتیس میل زمین بہت ہوتی ہے — ہاں بہت ! ناقص زمین تو فروخت کر ڈالوں گا اور اچھے اچھے کھیت خود رکھ لوں گا۔

طلوع سحر سے پیشتر ایک لمحہ کے لئے رتن چند کی آنکھیں جھپک گئیں اس نے خواب میں دیکھا کہ راجہ اس کے سامنے کھڑا ہنس رہا ہے۔ اس نے قریب جا کر ہنسنے کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ راجہ نہیں بلکہ رتن چند کو اس علاقے کا پٹہ بنا لینے والا مہمان ہے۔ رتن چند نے پوچھا —— " تم کہاں ؟"

لیکن اب جو بغور دیکھا تو وہ نئی آبادی کا پٹہ دینے والا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو شیطان کھڑا تھا۔ شیطان نے منہ کھول رکھا تھا اور اس کے پاؤں میں ایک آدمی دھوتی اور کرتہ پہنے مرا پڑا تھا۔ جھک کر دیکھا تو رتن چند تھا ! رتن چند گھبرا کر اٹھ بیٹھا ——— اوہو ! خواب میں بھی کیسے بھیانک منظر دکھائی دیتے ہیں۔

طلوعِ آفتاب سے پیشتر ہی وہ جنگل کی طرف چل دیا۔

(۸)

ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ کر راجہ نے کہا — "جہاں تک نگاہ جاتی ہے، ہمارا ہی علاقہ ہے۔ کہیں سے چکر کاٹنا شروع کر دو، دیکھو میں یہ چھڑی رکھ دیتا ہوں، بس غروبِ آفتاب تک یہاں پہنچ جانا۔"

رتن چند نے چھڑی پر ایک ہزار کی تھیلی رکھی اور روٹی پلّے باندھ کر چل دیا۔ تین میل چلنے پر ایک پہر دن چڑھ آیا اور گرمی اسے ستانے لگی

رتن چند نے دل میں کہا — "دن کے چار پہر ہوتے ہیں، ابھی تو تین پہر باقی ہیں، ابھی لوٹنا مناسب نہیں، جوتے اتار ڈالو، ننگے پیر چلنے میں آسانی ہوگی۔ تین میل اور چل کر پھر بائیں طرف مڑ جاؤں گا، یہ قطعۂ زمین بڑا اچھا ہے، اسے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ یہاں تو جوں جوں آگے بڑھتا ہوں، اچھی ہی اچھی زمین آتی جاتی ہے۔"

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا — راجہ وغیرہ کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے کہا — "شاید بہت آگے نکل آیا ہوں، اب لوٹنا چاہیئے، گرمی بہت بڑھ گئی ہے، پیاس سے حلق خشک ہوا جاتا ہے۔"

اس کے بائیں طرف لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو گئی۔ وہ ذرا دم لینے کے لیئے ٹھہر گیا، روٹی نکال کر کھائی، پانی پیا اور پھر چل کھڑا ہوا، سورج کی تمازت برداشت نہ ہوتی تھی، گرمی اتنی تھی کہ بدن جھلسا جاتا تھا۔ لیکن لالچ کا بھوت سر پر سوار تھا، کرے تو کیا کرے! کہنے لگا — "کچھ پروا

نہیں، آج ذرا سی تکلیف اُٹھا لوں گا تو زندگی بھر آرام سے رہوں گا ـــــــ
جب چلتے چلتے دُور نکل گیا۔ تو خیال آیا، کہ مجھ سے بھول ہو گئی۔ اگر پورا گھیرا
دیکر زمین کو چوکور بناؤں گا تو غروبِ خورشید سے پہلے وہاں پہنچنا ناممکن
ہو گا۔ اچھا تکون ہی سہی، یہیں سے لَوٹ چلو، مبادا سورج غروب ہو جائے
اور میں درمیان ہی میں رہ جاؤں!

(۹)

رتن چند اندازہ کر کے ناک کی سیدھ چھڑی کی طرف چلنے لگا۔ گرمی
کے مارے اس کا منہ سُوکھ گیا، جسم جھلس گیا، پاؤں زخمی ہو گئے، ٹانگیں تھک
گئیں، وُہ بے دم ہو گیا، لیکن ٹھہرے کیسے؟ سورج اس کا غلام تو تھا ہی
نہیں کہ اس کے لئے رُک جاتا۔

وُہ سوچنے لگا ـــــــ "اُف میں نے کیسی غلطی کی! لالچ نے مجھے
کہیں کا نہ رکھا، سورج ڈوبنے کو آیا، چھڑی کا ابھی تک کہیں پتہ نہیں،
اب کیا کروں؟ اَے ایشور! اَے بھگوان!!"

وُہ پگڑی سر سے پھینک کر، لاٹھی ہاتھ سے چھوڑ کر بے تحاشا دَوڑنے
لگا۔ اس کا دِل دَھک دَھک کر رہا تھا، سینہ لوہار کی دھونکنی بن گیا تھا
وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہو گیا تھا، اس کی ٹانگیں بُری طرح
لڑکھڑا رہی تھیں۔ اس نے سمجھا کہ اب جان گئی، وہ مایوس ہو کر چِلّا اٹھا:۔
ـــــ "مَیں ساری کے لالچ میں آ کر آدھی بھی کھو بیٹھا۔ لیکن اتنی تکلیف اٹھا
کر اگر مَیں اب ٹھہر جاؤں تو لوگ مجھے بے وقوف سمجھیں گے، جیسے بھی ہو

مجھے چھڑی تک پہنچنا چاہیئے۔
اتنے میں اسے لوگوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ دن اختتام کے قریب پہنچ گیا تھا، سورج جلد مغرب میں منہ چھپانے کو تھا، افق پر سرخی چھا رہی تھی۔ چھڑی سامنے دکھائی دینے لگی، راجہ پاس بیٹھا تھا، چھڑی پر ہزار روپے کی تھیلی پڑی تھی، اسے رات کا خواب یاد آیا۔ مایوس ہو کر بولا ــــ "زمین تو مل گئی، لیکن کیا میں چھڑی تک پہنچ سکوں گا؟"
اتنے میں سورج غروب ہو گیا ــــ آہ! اب وہ ٹیلے پر کس طرح پہنچے! وہ چلا اٹھا ــــ "آہ، میری سب بھاگ دوڑ اکارت گئی، سورج غروب ہو گیا۔"
ٹیلے پر سے لوگوں نے پکارنا شروع کیا ــــ "نہیں، نہیں، سورج ابھی غروب نہیں ہوا، دوڑو!"
وہ جی توڑ کر بھاگا اور آخر ٹیلے پر پہنچ گیا۔ دیکھا کہ چھڑی پڑی ہے راجہ پاس بیٹھا ہنس رہا ہے۔ پھر خواب یاد آیا۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔
گرتے گرتے اس کا ہاتھ چھڑی پر جا پڑا۔ راجہ بولا "بڑا دلیر اور دھن کا پکا آدمی ہے۔ اس نے کتنی زمین پر قبضہ کر لیا۔" لوگ جا کر اسے اٹھانے لگے تو دیکھا کہ اس کے منہ سے خون کی دھار بہہ رہی ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ اسکی زندگی کا خورشید بھی غروب ہو چکا ہے۔ لوگوں نے اسی وقت جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے اس کا داہ کرم کیا اور سب کو معلوم ہو گیا کہ اسے صرف ڈیڑھ دو گز زمین کی ضرورت تھی۔

مجرم

کسی گاؤں میں رحیم نامی ایک کسان رہا کرتا تھا، اس کے تین بیٹے تھے۔ تینوں جوان تھے۔ سب سے بڑے کی شادی ہو چکی تھی، منجھلے کی نسبت قرار پا چکی تھی، اور شادی ہونے والی تھی۔ چھوٹا بیٹا بھی اچھا سیانا ہو گیا تھا۔ وہ گھوڑا ہانک سکتا تھا اور کاشتکاری کر سکتا تھا۔

رحیم کی بیوی ہوشیار اور سلیقہ شعار عورت تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی بہو بھی صابر، فرماں بردار اور امور خانہ داری سے پوری طرح واقف تھی۔ رحیم اور اس کے کنبے کی زندگی نہایت اطمینان سے بسر ہو رہی تھی۔ گھر میں صرف ایک آدمی ایسا تھا جو کام کرنے سے معذور تھا یعنی رحیم کا باپ، جو دمے کے مرض میں مبتلا تھا اور سات برس سے آتش دان کے پاس چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ تمام ضروری سامان رحیم کے پاس موجود تھا۔ تین گھوڑے، ایک بچھڑا، ایک گائے اور پندرہ بھیڑیں۔ عورتیں ضرورت کے مطابق کپڑا بُن لیتی تھیں اور کھیتی باڑی کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتی تھیں، مرد کھیتوں پر کام کرتے تھے۔ ہر فصل پر اتنا غلہ ہو جاتا تھا جو دوسری فصل تک کافی ہوتا تھا اور بعض اوقات بچ بھی رہتا تھا۔ باجرہ فروخت کر کے لگان ادا کر دیا کرتا تھا اس سے بالائی اخراجات بھی پورے ہو جاتے تھے۔

ایک دفعہ رحیم اور اس کے ہمسایہ روشن لال کے بیٹے گوبند رام میں جھگڑا ہو گیا۔ اگر یہ جھگڑا نہ ہوتا تو رحیم اپنے بال بچوں سمیت ہمیشہ بڑی راحت و اطمینان سے اپنی زندگی بسر کرتا۔

جس زمانہ میں روشن لال زندہ تھا اور رحیم کا باپ گھر کا کام کاج کیا کرتا تھا۔ اس وقت ان دونوں کسانوں میں دوستی تھی اور وہ شریف ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔

اگر کسی کو چھلنی، پرات، بوری یا گاڑی کے پہیے کی ضرورت ہوتی تو دوسرے کے گھر سے مانگ کر اپنا کام چلا لیتے تھے۔ دونوں گھرانے حقیقی ہمسایوں کی طرح ایک دوسرے کی مدد کرتے، ایک کا بچھڑا اگر دوسرے کے کھلیان میں چلا جاتا! تو وہ اس کو باہر نکال کر دوسرے سے کہہ دیتا کہ "ہمارا اناج باہر پڑا ہے بچھڑے کو ذرا سنبھال لو" وہ نہ تو کھلیان اور ڈیوڑھی میں قفل لگاتے نہ ایک دوسرے سے اپنی کوئی چیز چھپاتے اور نہ ایک دوسرے کی چغلی ہی کھاتے۔

یہ بڈھوں کے زمانے کی بات ہے، لیکن جب بیٹے گھر کے مالک ہوئے تو سارا نقشہ ہی بدل گیا۔ ایک چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہو گیا اور عداوت و مخالفت نے محبت و ہمدردی کی جگہ لے لی۔

اس جھگڑے کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ رحیم کی بہو کی مرغی نے وقت سے کچھ پہلے ہی انڈے دینے شروع کر دیئے۔ بہو انڈوں کو سردیوں کے لئے جمع کرتی جاتی تھی۔ گاڑی کے اُسارے میں اس کو ہر روز ایک انڈا مل

جاتا تھا۔ لیکن ایک دن بچوں نے مرغی کو چمکا دیا، مرغی دیوار پر سے اُڑ کر ہمسایے کے احاطے میں جا بیٹھی اور وہیں انڈا دے دیا۔ بہو نے مرغی کی آواز سنی لیکن سوچا کہ ابھی کام میں مصروف ہوں، جمعہ قریب آرہا ہے، گھر کو صاف کرنا ہے۔ اس لئے انڈا پھر اٹھا لاؤں گی ——— لیکن جب شام کو وُہ اسارے میں گئی تو انڈا نہ ملا۔ اس نے اپنی ساس اور بڑے دیور سے دریافت کیا کہ کسی نے انڈا تو نہیں اٹھایا؟ دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لیکن چھوٹے دیور رمضان نے کہا۔ کہ تمہاری مرغی نے ہمسائے کے احاطے میں انڈا دیا ہے، وہیں وُہ کڑ کڑا رہی تھی اور وہیں انڈا دے کر دیوار پر سے اُڑ کر ادھر آئی ہے۔

بہو نے جا کر مرغی کو دیکھا۔ مرغی موجود تھی مگر اس سے کیا پوچھتی؟ وہ ہمسائے کے گھر گئی۔ اس کو دیکھتے ہی گوبند کی ماں باہر نکل آئی اور بہو سے پوچھا "کیوں بیٹی کچھ کام ہے؟"

بہو بولی ـــ "ہماری مرغی دیوار پھاند کر ادھر آ گئی تھی دیکھنے آئی ہوں ـــ وُہ یہیں کہیں انڈا دے گئی ہے۔"

بڑھیا نے جواب دیا۔ "ہم نے تو انڈا نہیں پایا۔ خدا کے فضل سے ہماری اپنی مرغیاں بہت دنوں سے انڈے دے رہی ہیں۔ اس لئے ہمیں دوسروں کے انڈوں سے کیا واسطہ؟ ہم دوسروں کے گھروں سے انڈے مانگتے نہیں پھرتے۔"

بہو نے اس بات کا بُرا مانا اور ایک سا کی دو سُن سنا ئیں۔ بڑھیا بھی کچھ کم

نہ تھی۔ دونوں میں گالی گلوچ ہونے لگی۔ رحیم کی بیوی پانی کا گھڑا اٹھائے ادھر سے گزر رہی تھی وہ بھی لڑائی میں شامل ہو گئی۔ گوبند کی بیوی بھی آواز سن کر گھر سے نکل آئی، ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سب چلا رہی تھیں اور ایک ایک بات میں دو دو گالیاں سُنانی تھیں۔

"تو ایسی ہے۔" "تو ویسی ہے۔" "تجھ میں سو خرابیاں ہیں"۔ "تو چور ہے اور تو بد چلن ہے۔" "تو اپنے سُسر کو بھوکوں مارتی ہے۔" "میری چھلنی مانگ کر لے گئی اور اس میں شیطان کی بیٹی نے چھید کر دیا۔" "ہمارا بانس لے گئی، اب اسی پر پانی لاتی ہے۔ لا میرا بانس ابھی دیدے۔"

اُنہوں نے بانس چھین لیا۔ پانی بہہ گیا، ایک دوسرے کے کپڑے پکڑ کر کھینچ تان ہونے لگی۔ گوبند کھیت سے واپس آیا تو وہ بھی اپنی بیوی کی حمایت کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر رحیم اور اس کا بیٹا بھی بھاگا آیا۔ رحیم مضبوط آدمی تھا اس نے سب کو ڈانٹا اور باتوں ہی باتوں میں گوبند کی داڑھی پکڑ لی۔ ہمسایوں نے جب یہ شور سنا، تو دوڑے دوڑے آئے کہ معاملہ کیا ہے؟ آخر کار انہوں نے بیچ بچاؤ کرکے سب کو الگ کر دیا۔

اس مختصر سے جھگڑے نے مستقل عداوت کی شکل اختیار کر لی۔ گوبند کی داڑھی کے چند بال ہاتھا پائی میں نوچے گئے تھے۔ اس نے ان بالوں کو کاغذ میں لپیٹ لیا اور عدالت میں جا کر نالش کر دی۔ وہ سب سے یہی کہتا کہ میں نے داڑھی اس لئے نہیں رکھی تھی کہ پاجی رحیم اسے نوچ ڈالے، اس کی بیوی الگ غصہ میں بھری ہوئی تھی۔ وہ بھی یہی کہتی پھرتی کہ رحیم کو ضرور

بالضرور سزا دلا کر کالے پانی بھجواؤنگی۔

غرض فساد بڑھتا چلا گیا۔

رحیم کے بوڑھے باپ نے بہتیرا کہا سنا کہ ایسا نہ کرو۔ مگر بوڑھوں کی بات پر کون کان دھرتا ہے۔ وہ رحیم سے کہتا۔ "ذرا ذرا سی بات پر لڑنا جھگڑنا بے وقوفوں کا کام ہے۔ ایک انڈے کے لئے اس قدر جھگڑا کیا۔ کیا خبر کہ انڈا کوئی بچہ ہی اٹھا کر لے گیا ہو، ایک انڈے کی بات ہی کیا ہے؟ خدا سب کو روزی دیتا ہے۔ فرض کرو پڑوسیوں نے کوئی بات سخت بھی کہہ دی تھی تو تمہیں صبر کرنا چاہیئے تھا۔ انہیں تمہارے صبر سے معلوم ہو جاتا کہ شریف آدمی کیسے ہوتے ہیں؟ زندگی میں جھگڑا تو کبھی کبھار ہو جاتا ہے مگر اس کو اتنا طول دینا نادانی ہے۔ دوسروں کو کیا الزام دیں ہم سب خود گنہگار ہیں، صلح کر کے جھگڑے کو یہیں ختم کر دو۔ دل میں بغض رکھو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔"

جوانوں کے خون میں جوش موجزن تھا۔ وہ بڈھے کی اس نصیحت کو بے معنی بکواس سمجھتے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ رحیم کا سر پڑوسی کے سامنے جھکے

رحیم نے کہا۔ "میں نے اس کی داڑھی کب نوچی؟ اس نے آپ ہی تو نوچی تھی، یہ دیکھو اس کے بیٹے نے میرا کوٹ پھاڑ دیا ہے۔ اور اس کے سارے بٹن ادھیڑ دیئے ہیں۔"

مقدمے کی سماعت پہلے چھوٹی عدالت اور پھر ضلع کی عدالت میں ہوئی۔ اسی مقدمے کے دوران میں گوبند کی گاڑی کا دھرا گم ہو گیا۔

اس کے گھر کی عورتوں نے رحیم کے بیٹے پر الزام لگایا۔ وہ کہتی تھیں کہ ہم نے اُسے رات کے وقت گاڑی کے پاس جاتے دیکھا ہے اور فلاں شخص کہتا ہے کہ دُھرے کو وہ سرائے کے مالک کے ہاتھ فروخت کر رہا تھا۔

ایک اور مقدمہ دائر ہو گیا۔ کوئی دن خالی نہ جاتا جب ان میں کوئی جھگڑا نہ ہوتا ہو۔ بڑوں کی دیکھا دیکھی بچوں نے بھی ایک دوسرے کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ جب عورتیں ندی پر کپڑے دھونے جاتیں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر گالیاں دینی شروع کر دیتیں۔ ہاتھ سے زیادہ زبان چلتی اور ایسی ایسی فحش گالیاں دیتیں کہ سننے والا کانوں میں انگلیاں دے لیتا۔

شروع شروع میں تو محض گالیوں پر ہی اکتفا کی جاتی تھی، مگر رفتہ رفتہ چوریوں تک نوبت پہنچ گئی۔ بچوں نے بھی یہی وطیرہ اختیار کر لیا، دونوں گھرانوں کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ رحیم اور گوبند کے درمیان گاؤں کی پنچایت میں، چھوٹی کچہری میں، اور ضلع کی عدالت میں برابر مقدمات چلتے رہے، حتیٰ کہ حکامِ عدالت بھی عاجز آ گئے۔ کبھی رحیم کامیاب ہو جاتا اور کبھی گوبند کو کامیابی اور رحیم کو سزا ہو جاتی۔ ان مقدمات کی ہار جیت نے ان کی آتشِ مخاصمت کو اور تیز کر دیا۔ کتوں کی طرح دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ دونوں میں مقدمہ بازی جاری تھی۔ کبھی ایک کو قید یا جرمانہ ہو جاتا، اور کبھی دوسرے کو۔ ہر مقدمہ کے فیصلہ پر شکست خوردہ فریق دوسرے سے بدلہ لینے پر آمادہ ہو جاتا۔ چھ سال تک یہی

کیفیت رہی اور حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ بڈھا بار بار نصیحت کرتا، لیکن اس کی کون سنتا تھا؟

ساتویں برس ایک شادی کے موقعہ پر رحیم کی بہو نے گوبند کے متعلق یہ کہا کہ وہ گھوڑا چراتے پکڑا گیا ہے۔ گوبند نشے میں تھا، غصہ کو ضبط نہ کر سکا اور اسے اس زور سے اس کے گھونسا مارا کہ وہ ایک ہفتہ تک بستر پر لیٹی رہی، وہ حاملہ تھی، رحیم اس خیال سے خوش تھا کہ اسے گوبند پر مقدمہ کرنے کا ایک اور موقعہ مل گیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس مقدمے میں اگر گوبند کو کالے پانی نہ بھیجا گیا تو اسے قید تو ضرور ہوگی اور اس طرح یہ روگ ختم ہو جائے گا۔ مگر رحیم کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی — عدالت نے مقدمہ خارج کر دیا۔ رحیم نے مرافعہ دائر کیا۔ مقدمہ صدر عدالت کی طرف منتقل ہو گیا۔ رحیم نے بڑی تگ و دو کی، منشی اور سررشتہ دار کو دو بوتلیں شراب کی دیں۔ فیصلہ گوبند کے خلاف ہوا اور اسے بیس دُرّوں کی سزا کا حکم دیا گیا۔

رحیم نے فیصلہ سُن کر فاتحانہ انداز میں گوبند کی طرف دیکھا۔ گوبند کا رنگ زرد پڑ گیا، وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ رحیم باہر نکلا اور اپنا گھوڑا سنبھالنے لگا تو اسے یہ آواز سنائی دی کہ "اگر میرے دُرّے لگیں گے تو کیا مضائقہ ہے میں بھی وہ آگ لگاؤں گا کہ عمر بھر یاد رہے۔"

رحیم جلدی سے کمرۂ عدالت میں واپس آ کر کہنے لگا۔ "حضورِ عالی! ابھی ابھی چار آدمیوں کے سامنے گوبند نے میرے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دی ہے۔"

گوبند کو طلب کر کے عدالت نے پوچھا۔ "کیا تم نے آگ لگانے کی دھمکی دی ہے؟"

گوبند نے کہا۔ "سرکار! میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ آپ کو اختیار ہے، چاہے مجھے درّے لگوائیں یا قید کر دیں۔ میں کچھ بھی نہیں کرتا لیکن سزا مجھے مل جاتی ہے، اور رحیم جو چاہے کرے اسے کوئی نہیں پوچھتا۔"

گوبند اور بھی کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے اس نے اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ عدالت کا عملہ بھی خائف ہو گیا کہ کہیں یہ اپنے پڑوسی کو نقصان نہ پہنچائے۔

بوڑھا حاکم بولا۔ "دیکھو، اب تم ہوش میں آجاؤ اور صلح کر لو۔ گوبند! کیا تمہارے لئے یہ مناسب تھا کہ تم حاملہ عورت کو مارتے، میری بات مانو اور رحیم سے معافی مانگ لو، اگر یہ تم کو معاف کر دے گا تو میں بھی تمہاری سزا منسوخ کر دوں گا۔"

سررشتہ دار نے ہنس کر کہا۔ "جناب عالی! دفعہ ۱۱۷ کی رو سے یہ ناممکن ہے جب فریقین میں صلح نہ ہوئی تو عدالت نے فیصلہ کر دیا۔ اب فیصلہ کی تعمیل لازمی ہے۔"

حاکم نے سررشتہ دار کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ "تم خاموش رہو۔ خدا محبت کا سرچشمہ ہے، اس کا حکم ماننا انسان کا سب سے بڑا فرض ہے۔"

عدالت نے فریقین میں صلح کرانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی

کیونکہ گوبند معافی مانگنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ گوبند نے کہا۔" اگلے سال میری عمر پچاس برس کی ہو جائے گی، ایک بیٹا ہے اس کی بھی شادی ہو چکی ہے۔ دُرّوں کی سزا مجھے اب تک نہیں ہوئی تھی لیکن اس کینہ پرور رحیم نے یہ سزا بھی مجھے دلوادی۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس سے معافی مانگوں؟ میں نے اب تک بہت کچھ صبر کے ساتھ برداشت کیا ــــــ مگر رحیم بھی کیا یاد کرے گا۔"

گوبند کی آواز پھر لڑکھڑانے لگی اور اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا ــــــ !

گاؤں سات میل کے فاصلے پر تھا۔ رحیم غروب آفتاب کے وقت گھر پہنچا۔ اس نے زین اتاری اور گھوڑے کو اصطبل میں باندھ کر گھر میں داخل ہوا گھر میں کوئی نہ تھا، عورتیں جانوروں کو لینے گئی ہوئی تھیں اور لڑکے ابھی تک کھیت سے واپس نہیں آئے تھے۔ رحیم اندر گیا اور بیٹھ کر سوچنے لگا کہ گوبند سزا سنتے ہی کیسا زرد پڑ گیا تھا۔ اور اس نے کس طرح دیوار کی طرف اپنا منہ کر لیا تھا، یہی منظر اس کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ اس کا دل بھر آیا اس نے سوچا کہ اگر یہی سزا مجھے ملتی تو مجھ پر کیا گزرتی؟ ــــــ یہ خیال آتے ہی وہ لرز اٹھا، اس کو گوبند پر رحم آنے لگا۔ اسی اثنا میں اس کا باپ کھانسا، وہ بدستور انگیٹھی کے سامنے چارپائی پر پڑا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور نیچے اُتر کر آہستہ آہستہ سرکنے لگا اور ایک پیڑھی کے قریب آکر اس پر بیٹھ گیا۔ یہاں تک آتے میں اس کی سانس پھول گئی تھی کھانسی

بھی اُٹھنے لگی تھی۔ بہت دیر بعد جب اس کی سانس درست ہوئی تو اس نے میز کا سہارا لے کر رحیم سے پوچھا:۔

"کیا اس کو سزا ہو گئی؟"

رحیم نے جواب دیا۔ "ہاں بیس دُرّوں کی!"

بڈھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بہت بُرا ہوا —— رحیم تم بہت بُرا کر رہے ہو —— یہ بہت ہی بُرا ہوا۔ اُس کا اتنا نقصان نہیں ہو گا جتنا تمہارا ہو گا —— آہ! اس کو دُرّے لگیں گے تو تمہیں کیا مل جائے گا؟"

رحیم نے کہا۔ "آئندہ وہ ہوش سے کام لے گا!"

"کس معاملے میں وہ ہوش سے کام لے گا؟ تم سے زیادہ بُرا کام تو اس نے نہیں کیا"

"کیوں؟ اس نے کیا ہمارا کوئی کم نقصان کیا ہے؟ میری بیوی کو مار مار کر ادھ موئی کر دیا اور اب میرے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دیتا ہے کیا ان باتوں کے لئے اس کا شکریہ ادا کروں؟"

بڈھے نے سرد آہ کھینچ کر کہا۔ "رحیم! تم اِدھر اُدھر پھرتے ہو لیکن میں برسوں سے اس انگیٹھی کے پاس پڑا ہوں۔ شاید تم خیال کرتے ہو گے کہ تم سب کچھ دیکھتے ہو اور میں کچھ نہیں دیکھتا —— مگر حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل نہیں دیکھتے —— دشمنی نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی تمہیں نظر آ جاتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا —— اس

نے کونسی بُرائی کی، یا کون سی بُری بات کہی؟ اگر صرف اُسی نے بد کلامی اور بُرائی کی ہوتی تو کیا یہ جھگڑا کھڑا ہو سکتا تھا؟ تالی دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے۔ جھگڑا دونوں کے بغیر نہیں ہوتا۔ وہ بُرا سہی، لیکن اگر تم بھلے بنے رہو تو جھگڑا کیوں ہو؟ اس کی داڑھی کس نے نوچی؟ اس کے پھولوں کو کس نے تباہ کیا؟ اسے عدالت میں کس نے گھسیٹا؟ تم سارا الزام اسی کو دیتے ہو، تم خود اپنی زندگی خراب کر رہے ہو اور یہی سارے جھگڑے کی جڑ ہے۔ ہم لوگ اس طرح نہیں رہتے تھے، یہ باتیں میں نے تمہیں نہیں سکھائیں۔ کیا اُس کا باپ اور میں اس طرح رہتے تھے؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ ہم لوگ کیسے رہتے تھے؟ ہم اسی طرح رہتے تھے۔ جیسے ہمسایوں کو رہنا چاہیئے۔ اس کے گھر میں آٹا ختم ہو جاتا تو اس کے گھر کی کوئی عورت آ کر ہمارے گھر سے جتنا جی چاہتا آٹا مانگ لے جاتی۔ اگر اس کا باپ نہ پاس ہوتا تو میں اس کے گھوڑے کی دیکھ بھال کے لئے تمہیں کہہ دیتا۔ جب کبھی مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی میں جا کر روشن لال سے مانگ لاتا۔ ہم لوگوں کی زندگی بڑے آرام اور مزے سے گزری، مگر اب کیا حال ہے؟ اس روز ایک سپاہی جنگ جرمن کا حال بیان کر رہا تھا مگر تم لوگوں کی لڑائی تو جنگ جرمن سے بھی زیادہ سخت ہے۔ لوگ کیا اس طرح رہا کرتے ہیں؟ تم گناہ کر رہے ہو، تم عقلمند ہو اور گھر کے مالک ہو۔ تمام ذمہ داری تم پر عاید ہوتی ہے، عورتوں اور بچوں کو تم کیا سکھا رہے ہو؟ لڑنا جھگڑنا اور گالیاں دینا، ابھی تھوڑے ہی دن ہوتے ہیں کہ وہ ذرا سا چھوکرا رمضان ہمسائی چمپا کو گالیاں دے رہا تھا اور

اس کی ماں پاس کھڑی ہنس رہی تھی، کیا یہی ہونا چاہیئے ؟ ان باتوں کا جواب تمہیں دینا ہوگا۔ ذرا اپنے دل میں سوچو کہ کیا یہ باتیں تمہارے لئے مناسب ہیں ؟ تم نے ایک بات کہی، میں نے دو سنا دیں، تم نے ایک گھونسا مارا اور میں نے دو۔ بیٹا! یہ رسول صلی اللہ کی تعلیم کے خلاف ہے کوئی تلخ بات کہے تو صبر سے سنو، اس کا ضمیر خود اس کو ملامت کرے گا، یہی خدا کی تعلیم ہے کہ اگر کوئی تمہارا دل دکھائے تو تم اس کا دل نہ دکھاؤ اور کہو کہ بھائی اگر تو یہی درست سمجھتا ہے تو اور بھی میرا دل دکھالے ——— اس کی روح اس کو مضطرب کر دے گی۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور وہ تمہاری طرف جھک جائے گا۔ یہ ہے خدا کی تعلیم! خدا نے غرور و تکبر کی تعلیم نہیں دی۔ بولتے کیوں نہیں ؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ؟"

رحیم خاموشی سے سنتا رہا ——— بڈھے نے کھانس کر اپنا گلا صاف کیا اور پھر کہنے لگا:۔

" شاید تم خیال کرتے ہوگے کہ رسول صلی اللہ کی تعلیم صحیح نہیں ——— کیوں؟ میں تمہارے بھلے کی کہتا ہوں۔ جب سے تم نے لڑائی شروع کر رکھی ہے ذرا سوچو کہ تمہیں فائدہ پہنچا ہے یا نقصان ؟ ذرا حساب تو کرو کہ تھوڑا تھوڑا کرکے عدالت کتنا روپیہ کھا گئی ؟ آنے جانے اور کھانے پینے میں کیا خرچ ہوا ؟ تمہارے بیٹے جوان ہو رہے ہیں۔ مگر تمہاری قسمت چکر میں ہے کیوں ؟ اسی بیوقوفی کی وجہ سے! تمہارے غرور کی وجہ سے، تمہیں لڑکوں سمیت کھیت میں کام کرنا چاہیئے تھا، تمہیں جو تنے بونے کی فکر ہونا چاہیئے تھی

لیکن تمہارے سر پر تو شیطان سوار ہے جو کبھی تمہیں عدالت میں کھینچ لے جاتا ہے اور کبھی کسی دوسری جگہ۔ اگر تم نے وقت پر نہ جوتا اور نہ بویا تو فصل کہاں سے ہوگی؟ ـــــ اس سال جوار کی فصل کیوں نہیں ہوئی؟ تم نے کتنی دیر سے جوار بوئی تھی؟ تمہیں کیا نفع ہوا؟ ـــــ ایک اور بوجھ سر پر آپڑا ـــــ بیٹا! اپنے کام کی دیکھ بھال کرو، لڑکوں کو ساتھ لے کر کھیتی باڑی میں لگو، گھر کا کام کاج سنبھالو، اگر کوئی تم سے بد کلامی کرتا ہے تو اسے معاف کر دو، خدا بھی چاہتا ہے۔ اس کی مرضی پر چلوگے تو زندگی آرام سے گزرے گی اور طبیعت بھی مطمئن رہے گی۔"

رحیم بدستور خاموش تھا۔ بڈھے نے پھر کہنا شروع کیا:۔

"بیٹا رحیم! اپنے بڈھے باپ کی بات مانو، جاؤ گھوڑے پر زین کسو اور عدالت میں پہنچ کر ان سب جھگڑوں کو ختم کر دو، اور خدا کے لئے کل گوبند کے پاس جا کر بھی صلح کر لو۔ کل تہوار ہے۔ کل شام کے کھانے پر ان لوگوں کو مدعو کرو۔ صلح کرنے کے لئے یہ وقت اچھا ہے۔ اس قضیہ کو اب کسی طرح ختم کر دینا چاہیئے تاکہ آئندہ زندگی آرام سے گزرے ـــــ اور ہاں عورتوں اور بچوں کو بھی سمجھا دو!"

رحیم نے ٹھنڈی سانس لی اور سوچنے لگا۔ "اباجی کہہ تو ٹھیک رہے ہیں" اس کے دل میں جھگڑا ختم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی مگر جھگڑا اتنا بڑھ چکا تھا کہ مصالحت کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

بڈھا اس کی اس الجھن کو تاڑ گیا ـــ وہ سمجھ گیا کہ رحیم اس وقت کس

خلفشار میں ہے۔ اس نے پھر کہا۔" رحیم جاؤ، کسی کام کو ٹالنا اچھا نہیں ہوتا۔ آگ کو زیادہ بڑھنے سے پہلے ہی بجھا دینا چاہیئے اگر شروع میں غفلت کی جائے تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔"

بڈھا کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس اثنا میں گھر کی عورتیں بولتی ہوئی آپہنچیں۔ انہیں پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ گوبند کو دُرّوں کی سزا ملی ہے۔ اور یہ کہ گوبند نے اُن کے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دی ہے۔ وہ یہ سب کچھ سن چکی تھیں۔ کچھ اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر انہوں نے یہ ساری باتیں گوبند کے گھر کی عورتوں کو کھیت ہی میں سنا دی تھیں۔ انہوں نے گھر آکر کہا کہ گوبند کی بہو ایک اور مقدمہ دائر کرنا چاہتی ہے۔ سُنا ہے کہ گوبند نے حاکم کو اپنی طرف کر لیا ہے۔ اس لئے اب کی دفعہ فیصلہ ہمارے خلاف ہو گا سکول کے مدرس نے افسر کی خدمت میں عرضداشت روانہ کر دی ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک رحیم کا کچا چٹھا تحریر کر دیا ہے۔ دُھرے کی دھری اور باغیچے والی بات سب کچھ بیان کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب کی بار رحیم کی آدھی زمین پر قبضہ کئے بغیر پیچھا نہیں چھوڑیں گے —"

یہ باتیں سن کر رحیم کا دل پھر مکدّر ہو گیا اور گوبند سے صلح کرنے کی تجویز پس پشت ڈال دی گئی۔

کسان کو ہر وقت ایک نہ ایک کام رہتا ہے۔ رحیم نے عورتوں سے کل بات نہ کی۔ سیدھا کھلیان اور اسارے کی طرف چل دیا۔ وہاں جھاڑتا اور صاف کرتا رہا۔ اسی دوران میں سورج غروب ہو گیا اور

اس کے بیٹے بھی کھیت سے واپس آگئے، وہ جاڑوں کی فصل کے لئے کھیت کی جتائی کر رہے تھے۔ رحیم نے کام کاج کے بارے میں ان سے پوچھ پوچھا اور سب چیزیں مناسب جگہ پر رکھوائیں۔ گھوڑے کی گردن کا پٹا ٹوٹ گیا تھا اس کو مرمت کے لئے الگ رکھا۔ کھلیان میں لکڑیاں رکھنے جا رہا تھا کہ بالکل اندھیرا ہو گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر جانوروں کو چارا ڈالا۔ پھاٹک کھول کر ان بیلوں کو باہر نکالا جنہیں رمضان رات کو ہل چلانے کے لئے لے جانے والا تھا۔ پھر پھاٹک بند کر دیا۔ وہ اب کھانے پینے سے فارغ ہو کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ گھوڑے کا پٹا لے کر وہ اپنے گھر کی طرف چلا۔ اسے نہ تو گوبند کا کوئی خیال تھا اور نہ بوڑھے باپ کی نصیحت کی کوئی پروا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہونے لگا۔ اس کے کان میں پڑوسی کی آواز آئی وہ کسی کو بہت زور سے کہہ رہا تھا۔ "وہ کم بخت بنا کیا پھرتا ہے، اس کا تو قصہ ہی پاک کر دینا چاہیئے۔" ان الفاظ کے سنتے ہی رحیم کے دل میں پھر کدورت پیدا ہو گئی۔ وہ کھڑا گوبند کی باتیں سنتا رہا اور جب گوبند چپ ہو گیا تو رحیم بھی گھر میں چلا گیا۔

گھر میں ایک چراغ روشن تھا۔ بہو چرخہ کات رہی تھی، بیوی کھانا پکا رہی تھی، بڑا لڑکا کھڑاؤں کے لئے لکڑی ٹھیک کر رہا تھا، منجھلا بیٹا بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا، رمضان کھیت جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اگرچہ اس گھر میں راحت و آرام کی ساری چیزیں موجود تھیں، مگر پڑوسی کے جھگڑے نے ساری حالت ہی بدل دی تھی۔

رحیم غصّہ میں بھرا ہوا اندر آیا۔ بلّی کرسی پر بیٹھ گئی تھی اس کو اُٹھا کر پٹک دیا۔ پھر عورتوں سے بگڑنے لگا۔ گوبند کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ نالش کی دھمکی کا اسے خیال آیا۔ ابھی ابھی وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا تو قصہ ہی ختم کر دینا چاہیئے۔ یہ الفاظ اس کے دل پر نقش ہو گئے۔ اس کی بیوی نے رمضان کو کھانا دیا۔ کھانا کھا کر رمضان نے کمبل اوڑھ لیا، کمر میں پٹکا باندھا، کچھ روٹیاں ساتھ لیں اور بیلوں کو سنبھالنے کے لئے باہر نکل گیا۔ بڑا بھائی اس کو پہنچانے جا رہا تھا کہ تو د رحیم نیچے اترا بیٹے کو گھوڑی پر سوار کر دیا اور بچھیرے کو پیچھے ہانک دیا۔ رمضان کھیت کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن رحیم وہیں کھڑا ٹاپوں کی آواز سنتا رہا۔ رمضان گاؤں کے اور لڑکوں کے ساتھ ہو لیا۔ جب سب دور نکل گئے تو رحیم بھی واپس مڑا اور دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ گوبند کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے کہ "وہ آگ لگاؤں گا جو عمر بھر یاد رہے"۔

رحیم نے سوچا کہ کیا تعجب وہ کچھ کر گزرے، چاروں طرف پھونس ہی پھونس ہے۔ ہوا بھی اس وقت زوروں پر ہے۔ ممکن ہے وہ پچھواڑے کی طرف سے آئے اور آگ لگا کر بھاگ جائے۔ ہمارا گھر خاکستر ہو جائیگا اور وہ اُلّو کا پٹھا صاف بچ جائے گا اور اگر کہیں یہ پاجی آگ لگاتے پکڑا گیا تو چھٹی کا دودھ یاد کرا دونگا۔

یہ خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے، وہ گھر میں نہ گیا بلکہ موڑ پہ جا نکلا۔ اس نے سوچا کہ یہیں گھر کے چاروں طرف چکر لگاؤں گا۔

معلوم وہ کیا کر بیٹھے ——— چنانچہ وہ دبے پاؤں پھاٹک سے نکلا اور دوسرے موڑ پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر چار دیواری کو دیکھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ دوسرے کونے پر کوئی جھٹ سے نکل کر پھر غائب ہو گیا۔ وہ چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔ ہر طرف سناٹا تھا، کبھی کبھی بیلوں کی پتیاں ہوا میں کھڑکھڑاتی تھیں۔ کبھی پھوس کے چھپروں پر سے ہوا سنسناتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ پہلے تو بالکل اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن جب آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو گئیں تو دوسرا کونہ نظر آنے لگا۔ وہاں ایک ہل اور چند بنڈ پڑے تھے۔ اس نے اچھی طرح دیکھا لیکن کچھ دکھائی نہ دیا۔

رحیم نے خیال کیا کہ شاید مجھے مغالطہ ہوا ہے۔ تاہم مجھے چل کر دیکھ لینا چاہیئے۔

رحیم کے پاؤں میں کھڑاویں تھیں لیکن وہ ایسی آہستگی سے چلا کہ خود اس کو اپنے پاؤں کی چاپ سنائی نہ دیتی تھی۔ جب وہ کونے کے پاس پہنچ گیا تو اس کو ایسا معلوم ہوا کہ ہل کے قریب کوئی چیز بھڑک کر غائب ہو گئی ہے۔ رحیم کا کلیجہ دھڑکنے لگا وہ رک گیا ——— وہ رکا ہی تھا کہ ایک بار پھر کوئی چیز تیزی سے چمکی۔ اسی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کی طرف پیٹھ کئے کوئی شخص بیٹھا ہے۔ اس کے سر پر ٹوپی ہے اور ہاتھ میں خشک مگر جلتی ہوئی گھاس رحیم بے چین ہو گیا۔ حوصلہ کر کے جلدی جلدی اس کی طرف چلا۔ اس کا خیال تھا کہ اب گو بند پکڑا جائے گا اور بچ کر نہیں جا سکے گا۔

ابھی رحیم اس کے پاس پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسری جگہ زور سے شعلہ بھڑک اٹھا۔ بنڈیرے کے پاس چھپّر جل رہا تھا۔ شعلے چھت تک پہنچ رہے تھے، انہی شعلوں کے قریب گوبند کا پورا جسم صاف نظر آرہا تھا۔

جیسے باز مولے پر جھپٹتا ہے ویسے ہی رحیم گوبند کی طرف جھپٹا۔ وہ گوبند کو پکڑنا چاہتا تھا۔ مگر شاید گوبند نے اس کے پاؤں کی آہٹ سن لی تھی وہ پیچھے کی طرف گھوم کر کھلیان کے اندر سے ہوتا ہوا خرگوش کی طرح بھاگا۔ رحیم اس کے پیچھے چلّاتا ہوا دوڑا کہ "پاجی! اب بچ کر کہاں جائے گا ؟"

رحیم گوبند کو پکڑنے ہی لگا تھا کہ گوبند بچ کر نکل گیا۔ لیکن رحیم نے اس کے کوٹ کا دامن پکڑ ہی لیا۔ کوٹ پھٹ گیا۔ رحیم گر پڑا۔ لیکن جلدی سے اٹھا۔ اور زور زور سے چلّانے لگا۔ "مارو، پکڑو، چور، قاتل"۔ اور پھر اس کے پیچھے بھاگا۔ گوبند اب اپنے گھر کے دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ جب رحیم وہاں پہنچا اور گوبند کو پکڑنے لگا۔ تو اس کی کنپٹی پر کوئی پتھر سی سخت چیز اس زور سے آکر لگی کہ وہ تیورا گیا۔ اس کا سر بھنّا اٹھا۔ ابھی اس چوٹ سے سنبھلنے نہ پایا تھا کہ گوبند نے ایک ڈنڈا زور سے مارا۔

رحیم کا سر چکرا گیا۔ پہلے تو آنکھوں کے سامنے چنگاریاں اُڑنے لگیں پھر ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ اس کے بعد وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا۔ تو گوبند کا وہاں کوئی پتہ نہ تھا۔ دن کی طرح روشنی تھی، اس کے گھر کی طرف سے کسی انجن کے چلنے کی سی آواز آرہی تھی۔ رحیم نے مڑکر دیکھا، اس کے مکان کے پچھواڑے کا اُسارا جل رہا ہے، بغلی اسارے میں بھی آگ پہنچ چکی ہے، ہر

طرف سے شعلے اور دھواں چنگاریاں اڑا اڑا کر اس کے دوسرے چھپروں کی۔۔
طرف لا رہے تھے۔

رحیم دوہتڑ مار کر چلانے لگا۔ "یارو یہ کیا ؟ چھپر کے نیچے سے تھوڑا سا پھولس کھینچ کر رگڑ دیتے، آگ ختم ہو جاتی، یہ کیا ہو گیا" وہ بار بار یہی بڑبڑاتا تھا وہ چلانا چاہتا تھا مگر منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ اس نے بھاگنا چاہا مگر پاؤں بس سکت نہ تھی، وہ آہستہ آہستہ چلا لیکن لڑکھڑانے لگا۔ سانس پھول گئی تھوڑی دیر دم لینے کے لئے ٹھہر گیا، پھر چلا، جب وہ پچھواڑے کے اسارے تک پہنچا، بغلی اسارا بھڑک اٹھا، اور مکان کا ایک کونہ بھی آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس کے بعد پھاٹک کا چھجا بھی جلنے لگا۔ مکان سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ آنگن میں بھی پہنچنا ناممکن تھا۔ لوگ اکھٹے ہو گئے تھے مگر کوئی بھی کچھ نہ کر سکتا تھا ہمسایے اپنا مال و اسباب بچانے کی فکر میں تھے اور جانوروں کو اسارے سے باہر نکال رہے تھے۔ رحیم کے گھر کے بعد گوبند کے گھر کو آگ لگی۔ اب آگ اتنی تیز ہو گئی تھی کہ گلی کی دوسری طرف بھی پہنچ گئی۔ اور آدھا گاؤں جل کر راکھ ہو گیا۔

رحیم کے گھر کے لوگ اس کے بوڑھے باپ کو کسی نہ کسی طرح بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ باقی اپنی جانیں اور صرف پہنے ہوئے کپڑے بچا سکے جو بیل، کھیت پر گئے ہوئے تھے، ان کے سوا اور کچھ نہ بچا۔ تمام جانور، مرغیاں، گاڑی، ہل، عورتوں کے کپڑوں کے صندوق اور غلے کے ڈھیر سب خاکستر ہو گئے۔

گوبند کے گھر میں جانوروں کے علاوہ دو چار اور چھوٹی چھوٹی چیزیں بچ گئیں باقی سب کچھ جل گیا۔ آگ رات بھر جلتی رہی۔ رحیم اپنے گھر کے سامنے

کھڑا یہی رٹ لگاتا رہا۔"یارو یہ کیا ہوگیا؟ ذرا سا پھولس کھینچ کر رگڑ دینے سے آگ بجھ جاتی"۔ جب چھت گر گئی تو رحیم آگ میں گھس گیا اور ایک جلتے ہوئے شہتیر کو کھینچ لایا۔ دوسرا شہتیر لانے کو بڑھا تھا کہ ٹھوکر لگی اور آگ میں گر گیا۔

اس کا بیٹا جلدی سے بڑھا اور اس کو کھینچ کر باہر لایا۔ رحیم کے سر کے بال اور داڑھی جھلس گئی۔ بدن کے کپڑے جل گئے تھے۔ ہاتھ پر بھی زخم آیا تھا لیکن اسے کچھ نہ محسوس ہوا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے حواس باختہ ہو چکے ہیں۔ آگ جل رہی تھی اور رحیم کھڑا چلّا رہا تھا۔"یارو! یہ کیا ہو گیا؟ ذرا سا پھونس کھینچ کر رگڑ دینے سے آگ بجھ جاتی"۔

صبح سویرے گاؤں کے نمبردار کا لڑکا رحیم کو بلانے آیا۔"بھائی رحیم! تمہارے ابا جان قریب المرگ ہیں، تمہیں آخری بار دیکھنا چاہتے ہیں!"

رحیم کے حواس اتنے بگڑ چکے تھے کہ وہ باپ کو بھی بھول گیا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس سے کیا کہا گیا ہے اور پوچھنے لگا۔"کیسا باپ؟ کس کو بلایا ہے؟"

اس نے جواب دیا"وہ تم سے آخری ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ میرے گھر میں ہیں اور بستر مرگ پر ہیں، جلدی چلو"——— اتنا کہہ کر نمبردار کا لڑکا رحیم کا ہاتھ کھینچنے لگا۔ رحیم اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

جب بڈھے کو نکالا جا رہا تھا تو وہ بھی کچھ جھلس گیا تھا۔ لوگ اسے نمبردار کے گھر چھوڑ آئے تھے، کیونکہ اس کا گھر گاؤں کے دوسرے سرے

پر تھا اور وہ جگہ آگ کی زد سے باہر تھی۔

جب رحیم اپنے باپ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ نمبردار کی عمر رسیدہ بیوی بھی اس کے پاس ہی بیٹھی ہے۔ آتش دان کے قریب چند بچے کھیل رہے تھے۔ باقی لوگ آتش زدہ جگہ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ بوڑھا ایک بستر پر پڑا دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سرہانے کی طرف مٹی کا دیا روشن تھا۔ بیٹے کو آتا دیکھ کر وہ ذرا کھسکا۔ نمبردار کی بیوی نے اس کو بتایا کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ بوڑھے نے اسے قریب بلایا اور رحیم قریب ہو گیا۔

بوڑھے نے کہا۔" رحیم! میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ گاؤں بھر کو کس نے جلایا؟"

رحیم نے جواب دیا۔" اباجی! اس نے! میں نے خود اسے چھپر میں آگ لگاتے دیکھا۔ اگر میں آگ لگا ہوا پھولس کھینچ کر رگڑ دیتا، تو آگ فوراً بجھ جاتی۔"

بوڑھے نے کہا۔" رحیم! میں قریب المرگ ہوں۔ تمہیں بھی آخر ایک بار مرنا ہے۔ بتاؤ جرم کس کا ہے؟"

رحیم اپنے باپ کی طرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔

بوڑھا کہنے لگا۔" خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہو، جرم کس کا ہے؟ میں نے تم سے کیا کہا تھا؟

اب رحیم کو ہوش آیا۔ سسکیاں بھرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔
"اباجان! سارا قصور میرا ہے۔" اور وہ زانو ہو کر کہنے لگا۔ "مجھے معاف کر دو۔ میں آپ کے اور خدا کے سامنے قصوروار ہوں۔"
بوڑھے نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا۔ وہ اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر لے جا کر شاید دعا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ کر سکا۔ وہ رک گیا اور کہنے لگا۔
"سبحان اللہ! سبحان اللہ!" اور پھر رحیم سے پوچھا:۔
"رحیم اب تمہیں کیا کرنا چاہیئے؟"
رحیم رو رہا تھا۔ اس نے سسکیاں بھر کر جواب دیا۔ "اباجان! میں نہیں جانتا کہ ہم لوگوں کی حالت اب کیا ہو گی؟"
بوڑھے نے آنکھیں موند لیں اور ہونٹ دبائے، گویا کچھ اور بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھول کر کہا:۔
"رحیم! دیکھو! اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا کہ آگ کس نے لگائی ہے اگر تم کسی کی پردہ پوشی کرو گے تو خدا تمہیں دگنا اجر دیگا!"
اس کے بعد بوڑھے نے اپنے دونوں ہاتھ لمبے کر دیئے اور ہمیشہ کے لیئے آنکھیں موند لیں۔
رحیم نے باپ کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے گوبند کے متعلق کچھ نہ کہا کسی کو خبر تک نہ ہوئی کہ آگ کس نے لگائی تھی؟
اب رحیم کا دل گوبند کی طرف سے ذرہ بھر بھی میلا نہ تھا۔ گوبند حیران تھا کہ رحیم نے کسی کے پاس میرا نام کیوں نہیں لیا۔ پہلے تو گوبند

سہما سہما رہتا تھا مگر کچھ دنوں کے بعد یہ خوف دور ہو گیا۔ دونوں نے لڑنا جھگڑنا ترک کر دیا۔ ان کے بیوی بچوں نے بھی ایک دوسرے کو کوسنا چھوڑ دیا۔ جب تک دونوں نے اپنے گھر دوبارہ نہ بنا لئے دونوں ایک ہی گھر میں رہے۔

جب گاؤں از سر نو آباد ہوا تو اگر رحیم اور گوبند چاہتے تو اپنے گھر ایک دوسرے سے دُور بنا سکتے تھے۔ لیکن دونوں نے اپنے گھر پاس پاس ہی بنوائے اور پہلے ہی کی طرح ہمسائے بنے رہے۔

بعد ازیں یہ لوگ شریف ہمسایوں کی طرح رہنے لگے۔ رحیم کو اپنے باپ کی نصیحت یاد تھی کہ خدا کے احکام پر کاربند ہونا چاہیئے اور آگ کو شروع ہی میں فرو کر دینا چاہیئے۔ اب اس کو اگر کوئی گزند پہنچاتا تو وہ انتقام ہرگز نہ لیتا۔ بلکہ صلح کر لیتا۔ کوئی بُری بات کہہ دیتا تو وہ اچھی باتیں بنا کر اسکو نیکی کا راستہ دکھاتا اور یہی تعلیم وہ اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو بھی دیتا۔

رحیم نے اپنا گھر دوبارہ سنوار لیا اور اس کی حالت اب پہلے سے کہیں زیادہ بہتر اور اچھی ہو گئی۔

رہائی کا پروانہ

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں ؛

اندر کمار ایک خوبرو نوجوان تھا۔ شکل و صورت وجیہہ، بال سیاہ چمکیلے اور گھنگھریالے، آنکھوں میں دلکشی، ہنستا ہوا چہرہ !---- گانے سے اُسے خاص رغبت تھی۔ گلے میں سوز تھا اور لوچ بھی !! ورثے میں کافی دولت پائی تھی۔ لاہور میں دو دکانیں تھیں اور ایک عالیشان رہائشی مکان !

جیساکہ دولتمند والدین کی اولاد کا خاصہ ہوتا ہے، اندر کمار کو آغازِ شباب میں شراب پینے کی لت پڑ گئی تھی۔ لیکن باپ کی وفات اور شادی نے اُس کی زندگی میں تغیر و انقلاب پیدا کر دیا۔ خوش قسمتی سے بیوی نیک سیرت و خوبصورت ملی تھی، اس لئے وُہ شراب نوشی ترک کر کے تجارت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ایک دفعہ اس نے ہردوار کے کنبھ کے میلہ پر جانے کی تیاری کی۔ ایک تو تیرتھ یاترا ہو جائے گی اور دوسرے کاروبار میں نفع کی امید تھی، جب وہ بیوی بچوں سے رخصت ہونے لگا۔ تو بیوی نے کہا :-

" پرانیشور! آج نہ جایئے، میں نے بُرا خواب دیکھا ہے۔"
اندر کمار نے ہنس کر کہا۔ "تمہیں خوف ہے کہ میلے میں جا کر میں تمہیں بھول جاؤں گا؟"

" یہ تو نہیں معلوم کہ میں کیوں ڈرتی ہوں، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ میں نے بُرا خواب دیکھا ہے —— ہاں، میں نے دیکھا ہے کہ جب تم گھر آئے ہو، تو تمہارے بال سفید ہو چکے ہیں۔"

" یہ تو اچھا خواب ہے" اندر نے کہا۔" ایک شگون ہے۔ دیکھ لینا میں سب مال بیچ کر تمہارے لئے میلے سے اچھی اچھی چیزیں لاؤں گا۔"
یہ کہکر اس نے بیوی بچوں سے رخصت لی اور گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہُوا۔

جب وہ نصف راستہ طے کر چکا تو اسے ایک اور جان پہچان کا سوداگر مل گیا۔ اور دونوں اکٹھے سفر کرنے لگے۔ رات کو دونوں ایک سرائے میں ٹھہرے اور کھانا کھا کر لحفہ کو ٹھڑیوں میں سو گئے۔

اندر کمار کو بہت سویرے جاگ اٹھنے کی عادت تھی۔ اس نے یہ سوچ کر کہ صبح صبح سفر طے کرنا ٹھیک رہے گا، منہ اندھیرے ہی اٹھ کر گاڑی تیار کرائی اور سرائے والے کو پیسے دے کر آگے روانہ ہوا۔ پچیس میل چل کر اس نے گھوڑوں کو دم لینے کے لئے روکا، اور ایک سرائے میں ٹھہر گیا اور صحن میں بیٹھ کر ستار بجانے لگا۔

اچانک ایک گاڑی سرائے کے سامنے آ کر رُکی۔ اس میں سے ایک

سب انسپکٹر اور چند سپاہی اُترے۔ سب انسپکٹر نے اندر کمار کے پاس آ کر سوال کیا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

اندر سے نے اپنا نام و نشان بتا کر کہا۔" آیئے، تشریف رکھیئے، آپ کے لئے کیا منگواؤں؟"

لیکن انسپکٹر پھر پوچھنے لگا۔" رات کو تم کہاں ٹھہرے تھے، اکیلے تھے یا کوئی اور بھی ساتھ تھا، تم نے آج صبح اپنے ساتھی کو دیکھا تھا یا نہیں؟ تم وہاں سے منہ اندھیرے ہی کیوں چلے آئے؟؟"

اندر کمار کو حیرت ہوئی کہ یہ بات کیا ہے؟ ایسے سوالات کیوں پوچھے جا رہے ہیں؟ وہ حیرت زدہ سا بولا۔" آپ تو مجھ سے اس طرح دریافت کر رہے ہیں جیسے میں کوئی چور یا ڈاکو ہوں میں تو کنبھ کے میلے پر جا رہا ہوں۔ آپ کو مجھ سے کیا مطلب ہے؟"

" میں اس ریاست کا سب انسپکٹر ہوں اور یہ سوال اس لئے کر رہا ہوں کہ جس سوداگر کے ساتھ رات تم پچھلی سرائے میں ٹھہرے تھے، وہ قتل کر ڈالا گیا ہے۔ ہم تمہاری تلاشی لینے آئے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ سپاہیوں کی مدد سے اس کے اسباب کی تلاشی لینے لگا۔ یکایک تھیلے میں سے ایک خون آلود خنجر نکل آیا سب انسپکٹر نے پُر رعب آواز میں پوچھا:۔

" یہ خنجر کس کا ہے اور اس پر خون کیسے لگا؟"

اندر خنجر دیکھتے ہی لرزہ براندام ہو گیا تھا وہ خاموش رہ گیا اس کی زبان

خشک ہوگئی، بڑی مشکل سے ہچکچاتا ہوا بولا:۔ "م..... م..... میرا نہیں ..... م..... مَیں نہیں جانتا...... کس کا ہے؟"

سب انسپکٹر بولا۔ "آج صبح دیکھا گیا کہ سوداگر کا گلا کٹا ہوا ہے، اور وُہ چار پائی پر مرا پڑا ہے ـــــ تمہارے سوا اس کے پاس اَور کوئی نہ تھا، اب یہ خون آلود خنجر بھی تمہارے اسباب سے برآمد ہوا ہے، تمہارا زرد چہرہ ہی شہادت دیتا ہے کہ تمہیں نے اسے قتل کیا ہے۔ بتاؤ، تم نے اسے کیوں مارا اَور کتنے روپے چرائے ہیں؟"

اِندر نے قسم کھا کر کہا ـــــ "مَیں نے سوداگر کو قتل نہیں کیا۔ رات کھانا کھانے کے بعد سے میں نے اسے نہیں دیکھا، میرے پاس اپنے آٹھ سو روپے ہیں۔ یہ خنجر میرا نہیں ہے۔"

لیکن اس کی باتیں اُکھڑی اُکھڑی سی تھیں، چہرہ زرد پڑ گیا تھا، اور وہ مجرموں کی طرح زور زور سے کانپ رہا تھا۔

سب انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے باندھ کر گاڑی میں بٹھا دیں ـــــ جب سپاہیوں نے اسے جکڑ لیا تو وہ رونے لگا۔ سب انسپکٹر نے اس کا مال اسباب اور روپیہ ضبط کر لیا اور اسے تھانے لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔

(۲)

اس کے بعد لاہور سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کی گئی، معلوم ہوا کہ پہلے وہ شراب کا عادی تھا اور بدمست ہو کر گلی کوچوں میں بکتا پھرا

کرتا تھا ـــــ لیکن اب اس نے شراب ترک کر دی تھی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ حالات صاف اس کے خلاف تھے، وہ اپنی صفائی میں کوئی شہادت یا دلیل پیش نہ کر سکا۔

عدالت نے اسے ریاست کے سوداگر کو قتل کرنے اور بیس ہزار روپیہ چرانے کا مجرم ٹھہرایا۔ لیکن اس کی جوانی پر رحم کھا کر پھانسی کے بجائے اسے عمر قید کی سزا دی گئی۔

اندر کی بیوی کو جب خبر ملی تو اسے یقین نہ آتا تھا۔ وہ بال بچوں کو ساتھ لے کر ریاست میں پہنچی اور جیل کے افسران کی منت خوشامد کے بعد شوہر سے ملاقات کی اجازت حاصل کی۔ جب اس نے اپنے شوہر کو بیڑی پہنے، چوروں اور ڈاکوؤں کے حلقے میں دیکھا تو بے ہوش ہو کر گر پڑی، کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا اور بچوں سمیت شوہر کے پاس جا بیٹھی اور اس سے تمام ماجرا پوچھنے لگی۔ اندر نے بے کم و کاست سب داستان بیان کر دی۔

وہ بولی۔ "تو اب کیا ہو سکتا ہے؟"

اندر نے کہا۔ "تمہیں مہاراج سے درخواست کرنی چاہیئے۔"

"میں نے مہاراجہ سے رحم کی درخواست کی تھی، لیکن وہ نامنظور ہوئی۔"

اندر نے مایوس ہو کر سر جھکا لیا۔

وہ پھر بولی۔ "دیکھا، میرا خواب کیسا سچ نکلا۔ تمہیں یاد ہے نا

کہ میں نے تمہیں پہلے ہی جانے سے روکا تھا، لیکن تم نے میری ایک نہ مانی۔ سچ سچ بتاؤ کیا واقعی تم نے تو سوداگر کو قتل نہیں کیا ؟"

اندر نے گلوگیر آواز میں پوچھا ـــــ "کیا تمہیں بھی مجھ پر شک ہے ؟"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ اتنے میں ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اور پہرے دار نے آکر اس کے بیوی بچوں کو جانے کے لئے کہا۔ سب روتے ہوئے رخصت ہوئے اور آندر ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہو گیا ـــــ رو رو کر قید کی گھڑیاں گزارنے کے لئے۔

گھر والوں کے چلے جانے پر جب اندر نے خیال کیا کہ میری بیوی بھی مجھے مجرم سمجھتی ہے۔ تو اس نے دل ہی دل میں کہا ـــــ "واقعی دنیا حقیقت کو نہیں دیکھ سکتی۔ خدا کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا کہ میں مجرم ہوں یا بے گناہ ! اسی سے رحم کی امید رکھنی چاہیئے۔

کچھ عرصہ کے بعد اسے لوہگڑھ کے جیل خانے میں بھیج دیا گیا۔

وہ چھبیس ۲۶ برس تک لوہگڑھ کے جیل خانے میں پڑا رہا۔ اس کے بال سفید ہو گئے، کمر جھک گئی اور جسم گھل گیا۔ وہ ہمیشہ اداس رہتا۔ نہ کبھی ہنستا نہ بولتا ـــــ لیکن ایشور کا بھجن دن رات کیا کرتا۔

جیل میں دری بننے کا کام سیکھ کر اس نے کچھ پیسے جمع کر لئے اور جیل کے افسروں سے کہہ کر ایک بھجنوں کی کتاب اور ایک گیتا منگوا لی۔ دن

بھر کام کرنے کے بعد جب تک سورج کی روشنی رہتی وہ بھجن اور گیتا پڑھا کرتا جیل کے ملازم اس کی عزت کرنے لگے تھے۔ قیدی اسے بوڑھے بابا دہماتما کہہ کر پکارتے تھے۔ قیدیوں کو جب کبھی کوئی درخواست بھیجنا ہوتی۔ تو وہ اسی کو اپنا سربراہ بناتے اور اسی سے اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کروایا کرتے تھے۔

گھر سے اسے کوئی خبر نہ آتی تھی اور اب اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے بیوی بچے زندہ بھی ہیں یا مر کھپ گئے۔

(۳)

ایک دن کچھ نئے قیدی اس جیل میں آئے۔ شام کو پرانے قیدی ان کے پاس آکر پوچھنے لگے کہ بھائی تم کہاں کہاں سے آئے ہو؟ اور کس کس جرم میں تمہیں سزا ہوئی ہے؟ سب نے اپنی اپنی داستان سنانا شروع کی۔ اکشر چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔

ان نئے قیدیوں میں ایک ساٹھ برس کا بوڑھا لیکن ہٹا کٹا آدمی بھی تھا، جس کی داڑھی مونچھ بالکل صفا چٹ تھی۔ وہ کہہ رہا تھا:۔

"بھائیو میرے ایک دوست کا گھوڑا ایک درخت سے بندھا ہوا تھا مجھے ایک ضروری کام سے یہاں ریاست میں اپنے گھر آنے کی جلدی تھی، میں نے وہ گھوڑا کھول لیا اور اس پر سوار ہو کر گھر چلا آیا۔ یہاں آکر میں نے گھوڑا چھوڑ دیا۔ پولیس والوں نے مجھے چور ٹھہرا کر پکڑ لیا۔ اگرچہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میں نے کس کا گھوڑا چرایا ہے اور کہاں سے؟

—— میرا دوست نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اس لیئے چوری کے جرم میں مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ اس سے پہلے ایک دفعہ میں نے ایک ایسا جرم کیا تھا کہ میں لوہگڑھ کے جیلخانے میں بھیجے جانے کا سزاوار تھا۔ لیکن اس وقت مجھے کوئی نہ پکڑ سکا۔ اب کسی قصور کے بغیر ہی بھیج دیا گیا ہوں"۔

ایک قیدی نے پوچھا —"تم کہاں سے آئے ہو؟"

" میرا گھر تو یہیں ریاست میں ہے لیکن میں رہتا لاہور میں ہوں۔ میرا نام بلونت سنگھ ہے۔"

اندر نے پوچھا —" بھائی بلونت! تمہیں اندر کمار کے گھر والوں کا کچھ حال بھی معلوم ہے؟ وہ مر گئے یا زندہ ہیں؟"

" میں انہیں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں، اچھے مالدار ہیں، ہاں ان کا باپ یہیں کہیں قید ہے۔ اس کا جرم بھی میرے ہی ایسا تھا۔ بوڑھے بابا تم انہیں کیسے جانتے ہو؟ اور یہاں کیسے آئے؟"

اندر نے اپنی داستانِ غم نہ سنائی، ایک سرد آہ بھر کر کہا۔" میں چھبیس سال سے یہاں اپنے گناہوں کی سزا پا رہا ہوں!"

" تم نے کیا گناہ کیا تھا بابا؟ مجھے بھی تو بتاؤ!"

" جانے دو بھائی" اندر نے کہا۔" گناہوں کی سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔"

وہ اور کچھ نہ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن دوسرے قیدیوں نے اس کا تمام حال بلونت کو کہہ سنایا۔ بلونت سنگھ نے یہ حال سنا تو غور سے اندر

کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر گھٹنے پر ہاتھ مار کر بولا ۔۔۔ "اوہو، بڑے تعجب کی بات ہے، لیکن بھائی تم تو بالکل بوڑھے ہو گئے۔"

دوسرے قیدیوں نے اصرار کیا ۔۔۔ "تم اندر بابا کو دیکھ کر حیران کیوں ہوئے ؟ کیا تم نے پہلے کہیں اسے دیکھا ہے ؟"

لیکن بلونت سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا

اندر کے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ شاید بلونت اس سوداگر کے قاتل کو جانتا ہے، بولا ۔۔۔ "بلونت سنگھ! کیا تم نے یہ قصہ پہلے بھی سنا ہے اور مجھے بھی پہلے کہیں دیکھا ہے ؟"

" یہ بات تو ملک بھر میں مشہور ہو چکی ہے " بلونت سنگھ نے جواب دیا۔ " میں کس طرح نہ سنتا، لیکن بہت عرصہ گزر گیا اور اس لئے مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔"

" تمہیں یاد ہے کہ اس سوداگر کو کس نے قتل کیا تھا ؟"

" بلونت نے ہنس کر کہا ۔۔۔ " جس کے تھیلے سے خون آلود خنجر نکلا اور کون ؟ اگر کسی نے تھیلے میں خنجر چھپا بھی دیا ہو تو جب تک کوئی پکڑا نہ جائے اُسے قاتل کون کہہ سکتا ہے ؟ تھیلا تمہارے سرہانے رکھا تھا۔ اگر کوئی اور آ کر اس میں خنجر رکھتا تو تم ضرور جاگ اٹھتے۔"

اندر کو ان باتوں سے یقین ہو گیا کہ یہی سوداگر کا قاتل ہے۔ وہ اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ لیکن تمام رات اس کو نیند نہ آ سکی۔ رنج و غم سے

اس کا دل تڑپ رہا تھا۔ اسے تمام گزشتہ واقعات یاد آنے لگے۔ پہلے بیوی کا تصور آیا جب وہ میلے پر جانے سے منع کر رہی تھی اسے محسوس ہوا جیسے وہ سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ پھر اسے اس کی ہنسی کی دلکش آواز سنائی دی۔ پھر بچے ہنستے اور کھیلتے دکھائی دیئے۔ اس کے بعد اسے آغازِ شباب کا زمانہ یاد آیا، جب و، افکار و آلام سے آزاد ستار بجانا پھرا کرتا تھا۔ پھر وہ سرائے نظر آئی جہاں وہ گرفتار ہوا تھا۔ پھر جیل، بیڑیاں، مشقتیں، چھبیس سال کے مصائب و آلام!! سب باتیں اس کے سامنے پردۂ سیمیں کی تصاویر کے مانند دوڑنے لگیں۔ وہ اتنا غم زدہ ہوا کہ اس کے جی میں آیا ابھی خودکشی کر لوں۔

وہ اُٹھ کر بھجن کرنے لگا لیکن اسے تسکین حاصل نہ ہوئی۔

دوسرے دن اس نے بلونت کی طرف دیکھا تک نہیں۔ پندرہ دن اسی حالت میں گزر گئے، اسے نہ دن کو تسکین ملتی تھی نہ رات کو آرام! آٹھوں پہر وہ دل ہی دل میں جلتا رہتا تھا، کرب و اضطراب کے کانٹوں پر لوٹتا رہتا تھا۔

(۴)

ایک رات وہ بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا تھا کہ اس نے قیدیوں کے سونے کے چبوترے کے نیچے سے مٹی گرتے دیکھی — وہیں ٹھہر گیا کہ دیکھوں مٹی کہاں سے گرتی ہے۔ اچانک بلونت سنگھ چبوترے کے نیچے سے نکل آیا اور اسے دیکھ کر خوف سے کانپنے لگا۔ آنند نے آنکھیں بند کر کے

آگے جانا چاہتا تھا کہ بلونت سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "دیکھو میں نے جوتوں میں مٹی بھر بھر کر باہر پھینک کر یہ سرنگ لگائی ہے۔ دیکھو کسی سے کہنا نہیں۔ میں تمہیں اس راہ سے بھگا دیتا ہوں۔ اگر شور کرو گے تو جیل کے افسر مجھے مار ڈالیں گے۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ میں تمہیں مار کر مرونگا۔"

اندر اپنے دشمن کو اپنے سامنے دیکھ کر غصّے سے کانپ اٹھا اور ہاتھ چھڑا کر بولا ——"مجھے بھاگنے کی ضرورت نہیں —— اور مجھے مارے تو تمہیں چھبیس برس ہو گئے ۔ رہ گئی جیل کے افسروں کو آگاہ کرنے کی بات ، تو جو پرماتما کا حکم ہوگا وہی کرونگا۔"

دوسرے دن جب قیدی باہر کام کرنے گئے تو پہرے والے نے سرنگ کی مٹی باہر پڑی دیکھ لی۔ تلاش کرتے پر سرنگ مل گئی۔ جیل کا داروغہ سب قیدیوں کو بلا کر پوچھنے لگا۔ لیکن کسی نے نہ بتایا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر بتا دیا تو بلونت مارا جائے گا۔ جیل کے سب افسر اندر کو سچا جانتے تھے آخر داروغہ نے اس سے کہا۔ "بوڑھے بابا! تم سچے آدمی ہو، سچ سچ بتاؤ یہ سرنگ کس نے لگائی ہے؟"

بلونت اس کے قریب ہی اس طرح کھڑا تھا، جیسے کچھ جانتا ہی نہیں اندر کے ہونٹ اور پاؤں لرز رہے تھے۔ وہ چپ چاپ سوچنے لگا کہ جس نے میری تمام زندگی برباد کر دی ہے، اس کے جرم پر کیوں پردہ ڈالوں؟ اسے اپنے کئے کی سزا ضرور ملنی چاہیئے، جیسے دُکھ دیا تھا اسے بھی تو دکھ ملے۔ —— لیکن بتا دیا تو وہ بچ نہ سکے گا۔ شاید میرا یہ خیال کہ اس نے سوداگر

کو قتل کیا ہے محض وہم وگمان ہی ہو، اگر واقعی اس نے قتل کیا تھا، تو بھی مجھے اس کے قتل سے کیا فائدہ ہوگا؟

داروغہ نے پھر پوچھا ——— "بابا! خاموش کیوں ہو گئے؟ بتاتے کیوں نہیں؟"

" میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ آپ جو چاہیں کریں۔"

داروغہ نے بار بار پوچھا ——— پھر سپرنٹنڈنٹ نے بلا کر زور دیا لیکن اندر کو نہ بتانا تھا نہ بتایا۔ ناچار بات دبا دی گئی۔

اس رات ——— اندر اپنی کوٹھری میں لیٹا ہوا تھا کہ بلونت خاموشی سے اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اندر نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "بلونت سنگھ اب اور کیا چاہتے ہو؟ اس وقت یہاں کیوں آئے ہو؟"

بلونت سنگھ خاموش بیٹھا رہا۔

" تم کیا چاہتے ہو؟" اندر نے پھر کہا۔ "یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ میں پہرے دار کو بلا لوں گا۔"

بلونت سنگھ نے اس کے پاؤں پکڑ کر کہا ——— " اندر! مجھے معاف کرو، مجھے معاف کر دو!"

"کیوں؟"

" میں نے ہی اس سوداگر کو قتل کر کے خنجر تمہارے تھیلے میں رکھ دیا تھا میں تمہیں بھی قتل کرنا چاہتا تھا، لیکن باہر سے آہٹ ہوئی اور میں خنجر تھیلے میں رکھ کر بھاگ نکلا۔

اِندر خاموش رہا۔ ایک لفظ تک نہ بولا۔

بلونت سنگھ نے پھر کہا ـــ" بھائی اندر! پرماتما کے لئے مجھ پر رحم کھاؤ، مجھے معاف کر دو، میں اپنا جرم قبول کر لوں گا۔ تم آزاد ہو کر اپنے گھر چلے جانا۔"

" اندر نے کہا ـــ" باتیں بنانا آسان ہے، چھبیس برس کے اِن مصائب کو دیکھو۔ اب میں کہاں جا سکتا ہوں، عورت مر گئی، لڑکے مجھے بھول گئے اب تو میرا کہیں ٹھکانا نہیں "

بلونت سنگھ دیوار سے پیشانی مار کر رو رو کر کہنے لگا۔" مجھے کوڑے لگتے پر بھی اتنی تکلیف، اِتنا دُکھ نہیں ہُوا تھا، جتنا اب تمہیں دیکھ کر ہو رہا ہے تم نے مجھ پر رحم کھا کر سرنگ کی بات نہ بتائی، کتنی فراخدلی سے کام لیا، اب مجھے معاف کر دو، معاف کر دو! میرا دل جل رہا ہے "

یہ کہکر وہ زور زور سے رونے لگا، اندر کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی ندی بہ نکلی اور بولا:- "پرماتما تم پر رحم کریں، کون جانے میں اچھا ہوں یا تم! میں نے تمہیں معاف کیا"

× × ×——× ××——× × ×

دوسرے دن بلونت سنگھ نے خود سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا کر سب حال بیان کر کے اپنا جُرم تسلیم کر لیا۔ لیکن جس وقت اندر کی رہائی کا پروانہ پہنچا تو وُہ قیدِ زندگی سے آزاد ہو چکا تھا ۔

زیارت!

کشمیر کے ایک قصبے میں حسن نامی ایک دکاندار رہتا تھا سڑک پر اس کی چھوٹی سی دکان تھی، وہ بیحد شریف، نیکدل، راستباز اور دیانتدار تھا جو بات کہتا اُسے ضرور پورا کرتا۔ کبھی دھیلہ بھر کم نہ تولتا اور نہ گھی ہی میں کسی قسم کی ملاوٹ کرتا۔ چیز اچھی نہ ہوتی تو گاہک سے صاف صاف کہدیتا کسی کو دھوکا نہ دیتا۔

بیچارے کی اولاد بچپن ہی میں مرجاتی تھی۔ آخر ایک دن اسکی بیوی بھی ایک تین سال کا بچہ اپنی یادگار چھوڑ کر چل بسی۔ پہلے تو حسن نے سوچا اس بچے کو ننھیال بھیج دوں، لیکن بچے سے انتہائی محبت کے باعث اس کی جدائی گوارا نہ کرسکا اور خود ہی ماں کی طرح اس کی پرورش کرنے لگا۔ یہ بچہ ہی اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ اس کے آرام و آسایش کے لئے وُہ دن بھر کام کیا کرتا تھا، لیکن اولاد کی راحت شاید اس کی قسمت میں نہ تھی۔ بیس برس کی عمر میں وُہ لڑکا بھی خدا کو پیارا ہوگیا۔

حسن صدمے سے پاگل ہوگیا۔ اس کا ایمان متزلزل ہوگیا۔ ہمیشہ خدا کو بُرا بھلا کہا کرتا ——— خدا بڑا بے رحم اور بے انصاف ہے، مارنا مجھے بوڑھے کو چاہیئے تھا، لیکن مار ڈالا میرے نوجوان بیٹے کو ———! یہاں تک کہ اس نے مسجد میں جانا بھی چھوڑ دیا۔

ایک دن اس کا ایک پرانا دوست، جو آٹھ برس سے حج اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے گیا ہوا تھا اُس سے ملنے آیا۔ حسن نے کہا "دوست دیکھو، میرا تو گھر بار تباہ ہو گیا، اب میرا زندہ رہنا بیکار ہے۔ میں ہر روز موت کو بلاتا رہتا ہوں، اب کس امید پر زندہ رہوں"

دوست نے کہا۔ "حسن! ایسا نہ کہو، ہم خدا کی مشیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے، بیٹے کا فوت ہو جانا اور تمہارا زندہ رہنا سب قدرت کے کھیل ہیں اور کوئی اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارے صدمے اور غم کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ تم اپنی راحت و مسرت کو راحت سمجھتے ہو، دوسروں کی راحت سے مسرور نہیں ہوتے۔"

حسن نے پوچھا۔ "تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

"خدا کی بے غرض عبادت سے قلب و رُوح کی صفائی ہوتی ہے جب سب کام خدا کی مرضی کے تابع کر کے زندگی بسر کرو گے تو تمہیں روحانی مسرت و راحت حاصل ہو گی۔"

"لیکن دل کو قابو میں کرنے کا کوئی طریقہ بھی تو بتاؤ۔"

"تم قرآن، حدیث، بزرگانِ دین کے سوانحِ حیات اور تاریخ کا مطالعہ کرو، یہ کتابیں تسکینِ قلب و جان اور نجات کا وسیلہ ہیں۔"

اب حسن نے مذہبی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، نماز بھی پڑھنے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اسے ان کتابوں سے اتنی محبت ہو گئی کہ وہ رات کے بارہ بارہ بجے تک پڑھتا رہتا۔ اور ان کے نصائح پر غور کیا کرتا۔ پہلے تو وہ

سوتے وقت بیٹے کو یاد کرکے رو یا کرتا تھا لیکن اب سب کچھ بھول گیا۔ ہر وقت خدا کی یاد میں مست رہ کر آرام سے زندگی بسر کرنے لگا۔ پہلے تو وہ اِدھر اُدھر بیٹھ کر ہنسی مذاق بھی کر لیا کرتا تھا لیکن اب وہ وقت کو بیکار ضائع نہ کرتا تھا، یا تو دکان کا کام کرتا یا کوئی مذہبی کتاب لے کر بیٹھ جاتا اس کی زندگی میں ایک تغیر آگیا تھا، اصلاح ہوگئی تھی۔

ایک رات وہ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے سوانح بابرکات پڑھ رہا تھا کہ اس نے ایک جگہ دیکھا جسے رسولِ اکرمؐ خواب میں زیارت دیں، اسکی نجات یقینی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پڑھا کہ خدا کے بندوں پر رحم کرنے سے خدا خوش ہوتا اور رحم کرنے والے پر رحم وکرم کی بارش کرتا ہے حسن نے دل میں سوچا ـــــ جب خدا رحیم وکریم ہے تو کیا مجھے سب سے رحم وشفقت کے ساتھ پیش نہ آنا چاہیئے ؟ شاید اس طرح مجھے بھی رسول کریمؐ کی زیارت کا شرف حاصل ہو جائے۔

یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ باہر سے کسی نے پکارا۔

"حسن !"

وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا، اتنے میں پھر باہر سے کسی نے آواز دی۔ "حسن ! دیکھ کل میں تجھے زیارت دوں گا !"

یہ سُن کر وہ دُکان سے باہر نکل آیا اور سوچنے لگا یہ کس کی آواز تھی ؟ کیا یہ خواب تھا ؟ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا، وہ پھر دکان میں جا کر سو گیا ـــــ !!!

دوسرے دن علی الصباح اُٹھ کر، نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر وہ دکان میں آکر کھانا تیار کر کے اپنے کام میں لگ گیا لیکن رات کی آواز اس کے دل سے نہ اُترتی تھی۔

رات برفباری ہونے کے باعث سڑک پر برف جمی ہوئی تھی۔ حسن اپنی دُھن میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں کوئی آدمی برف ہٹا کر سڑک صاف کرنے کے لئے آیا۔ حسن نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ بوڑھا بشنو برف ہٹانے آیا ہے۔

بشنو برف ہٹانے لگا، بوڑھا آدمی تھا، سخت سردی سے کانپ رہا تھا اور برف ہٹانے میں دقّت محسوس کر رہا تھا۔ آخر تھک کر بیٹھ گیا۔ حسن نے سوچا ــــ اسے سردی لگ رہی ہے، ذرا آگ تپا دوں۔ یہ سوچ کر اس نے آواز دی :-

"بشنو بھیّا! تمہیں سردی لگ رہی ہے، یہاں آؤ، ذرا ہاتھ سینک لو ــــ"

بشنو دعائیں دیتا ہوا دکان پر آکر آگ تاپنے لگا!

حسن نے کہا "بھائی بشنو! میں برف ہٹا دیتا ہوں، تم بوڑھے آدمی ہو، ایسا نہ ہو سردی کھا جاؤ۔"

بشنو نے کہا "پرماتما تمہارا بھلا کریں، میں سردی سے مرا جا رہا تھا تم نے آگ نہ تاپنے دی ہوتی تو میں مر ہی گیا ہوتا۔"

"واہ بھائی بشنو!" حسن نے کہا۔ "یہ بھی کوئی بڑی بات ہے اس دکان کو تم اپنا گھر ہی سمجھو، میں تمہاری ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔"

بخشش شکریہ ادا کر کے چل دیا۔ اس کے بعد دو سپاہی آئے، پھر ایک کسان آیا، پھر ایک روٹی والا، سب اپنی اپنی راہ چلے گئے پھر ایک عورت آئی، وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھی، گود میں ایک بچہ تھا ـــــ دونوں سردی کے مارے کانپ رہے تھے۔

حسن نے کہا" مائی! باہر سردی میں کیوں کھڑی ہو، بچے کو جاڑا لگ رہا ہے اندر آجاؤ۔"

عورت اندر آگئی۔ حسن نے اسے انگیٹھی کے پاس بٹھا دیا۔ بچے کو تھوڑی سی مٹھائی دی اور پھر پوچھا ـــــ" مائی تم کون ہو؟"

عورت نے کہا۔" میں ایک سپاہی کی بیوی ہوں، میرا شوہر آٹھ مہینے سے ریاست کے کام پر کہیں گیا ہوا ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں گیا ہے۔ میں ایک جگہ باورچن کا کام کر رہی تھی، وہیں یہ بچہ پیدا ہوا ـــــ انہوں نے اس خیال سے کہ اب دو جانوں کے کھانے پہننے کو دینا پڑے گا، مجھے جواب دے دیا، تین مہینے سے ماری ماری پھرتی ہوں کوئی نوکر نہیں رکھتا۔ جو کچھ پاس تھا وہ بیچکر کھا چکی ہوں، اب ایک امیر آدمی کے پاس جا رہی ہوں، شاید نوکری مل جائے۔"

" تمہارے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں؟"

" کپڑا کہاں سے آئے، ایک کوڑی تک پاس نہیں۔"

حسن نے ایک دوشالہ دیتے ہوئے کہا۔" یہ لو دوشالہ، اسے اوڑھ لو ـــــ"

"خدا تمہارا بھلا کرے" عورت نے کہا "تم نے مجھ پر رحم کیا، خدا تم پر رحم کرے گا، بچہ سردی سے مرا جاتا تھا۔"

حسن نے عورت کو رات کا خواب سنایا، اس نے کہا۔ "حیرت کی کون سی بات ہے، محبوبِ خدا کی زیارت ناممکن تو نہیں!"

عورت کے چلے جانے پر ایک سیب بیچنے والی آئی، اس کے پاس ایک سیبوں کی ٹوکری تھی اور ایک اناج کی گٹھڑی۔ ٹوکری زمین پر رکھ کر، ایک کھمبے کا سہارا لے کر وہ دم لینے لگی۔ اتنے میں ایک لڑکا ٹوکری میں سے سیب اٹھا کر بھاگا۔ سیب والی نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور سر کے بال کھینچ کر اسے مارنے لگی۔ لڑکا بولا:۔ "میں نے سیب نہیں اٹھایا۔"

حسن نے اٹھ کر بچے کو چھڑا دیا اور عورت سے کہا۔ "مائی! جانے دے بچہ ہے۔"

سیب والی:۔ "یہ بڑا شریر ہے۔ میں اسے سزا دیئے بغیر نہ چھوڑوں گی۔"

حسن:۔ "مائی جانے دے، رحم کر۔ میں اسے سمجھا دونگا، پھر کبھی ایسا کام نہ کریگا۔"

سیب والی نے بچے کو چھوڑ دیا۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا کہ حسن نے اسے روک کر کہا۔ "بڑھیا سے اپنا قصور معاف کراؤ اور عہد کرو کہ آئندہ چوری نہ کرو گے۔ میں نے تمہیں سیب اٹھاتے دیکھا ہے۔ تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟"

لڑکے نے رو کر سیب والی سے معافی مانگی اور اقرار کیا کہ آئندہ نہ چوری کرونگا نہ جھوٹ بولوں گا۔

حسن نے خوش ہو کر اپنے پاس سے ایک سیب اسے دے دیا۔

سیب والی نے کہا "واہ، کیا کہنا، اس طرح تو تم قصبہ بھر کے لڑکوں کا ستیاناس کر دو گے ۔۔۔ یہ اچھی تعلیم ہے! اس طرح تو سب لڑکے شریر ہو جائیں گے۔"

حسن نے کہا "مائی! یہ کیا کہتی ہو؟ بدلہ اور سزا دینا تو انسان کی عادت ہے، خدا کی نہیں، خدا رحیم و کریم ہے، اگر اس بچے کو ایک سیب چرانے کی سخت سزا ملنی چاہیئے تو ہمیں ہمارے بے حساب گناہوں کی سزا کتنی ملنی چاہیئے؟ سنو! میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں ۔۔۔ ایک جاگیردار پر راجہ کے دس ہزار روپے واجب تھے۔ اس کے عاجزی اور منت خوشامد کرنے پر راجہ نے اسے قرض معاف کر دیا۔ اس جاگیردار کو بھی اپنے ماتحتوں سے سو سو روپے لینے تھے۔ وہ انہیں سخت تکلیف دینے لگا۔ انہوں نے بہتیرا کہا کہ ہمارے پاس پیسہ نہیں، قرض کہاں سے ادا کریں؟ لیکن اس نے ایک نہ سنی، آخر اُن سب نے راجہ کے پاس جا کر فریاد کی، راجہ نے اسی وقت اس جاگیردار کو سخت سزا دی اور کہا کہ ہمارا دس ہزار روپیہ ابھی ادا کرو، مطلب یہ کہ اگر ہم انسانوں پر رحم نہ کریں گے تو خدا ہم پر کیسے رحم کریگا۔"

سیب والی بولی "یہ تو سچ ہے لیکن ایسے برتاؤ سے لڑکے بگڑ جاتے ہیں۔"

حسن نے کہا "ہرگز نہیں! بگڑتے نہیں، بلکہ سدھرتے ہیں، نیک بنتے ہیں۔"

بڑھیا ٹوکرا اٹھا کر چلنے لگی تھی کہ حسن نے کہا۔" لاؤ مائی، میں ٹوکرا تمہارے گھر تک پہنچا آتا ہوں"۔

اُس رات حسن کھانا کھا کر بستر پر بیٹھا بزرگانِ دین کے حالات پڑھ رہا تھا کہ اس کی آنکھ جھپک گئی اور اُس نے یہ منظر دیکھا:۔

"حسن! حسن!!"

"کون ــ؟"

"میں ــ لشلو!

یہ کہہ کر لشلو ہنستا ہوا چلا گیا۔

پھر آواز آئی ــ" میں ہوں!"

حسن نے دیکھا صبح والی عورت دوشالہ اوڑھے، بچے کو گود میں لئے سامنے کھڑی ہوئی، ہنسی اور پھر غائب ہو گئی۔

پھر آواز آئی ــ" میں ہوں!"

دیکھا کہ سبب والی اور بچہ ہنستے ہنستے سامنے آئے اور غائب ہو گئے۔

حسن اٹھ کر بیٹھ گیا، اسے یقین ہو گیا کہ رسول خدا کی زیارت ہو گئی اور خدا نے مجھ پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیئے۔ انسانوں پر رحم کرنا ہی خدا اور رسول ؐ کی زیارت ہے۔!!

سُورَت کا قہوہ خانہ

ہندوستان کے مشہور شہر سورت میں ایک قہوہ خانہ تھا جہاں دنیا بھر کے لوگ جمع ہوتے تھے اور ادھر اُدھر کی گپیں ہانک کر چلے جاتے تھے، ایک روز ایک ایرانی عالم اس قہوہ خانہ میں آیا۔ اس شخص نے اپنی تمام عمر الٰہیات کی تحصیل و تکمیل میں صرف کر دی تھی اور ذات واجب الوجود سے متعلق کئی کتابیں لکھی تھیں، مگر آخر میں اس قدر حواس باختہ ہو گیا تھا کہ وجود الٰہی کے ماننے میں بھی اسے تامل تھا اور سمجھانے کے باوجود وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ اسکے ملحدانہ عقاید کے باعث شاہِ ایران نے اسے ملک بدر کر دیا تھا۔ اس کے پاس ایک حبشی غلام بھی تھا جو اس کے ساتھ ساتھ رہا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ خود تو قہوہ خانہ میں داخل ہو گیا اور غلام دروازے کے پاس سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اس پر دھوپ پڑ رہی تھی اور چاروں طرف سے مکھیاں جمع ہو کر اس کے ارد گرد بھنبھنا رہی تھیں۔

ایرانی عالم نے قہوہ خانہ میں ایک کرسی پر بیٹھ کر افیون کی ایک پیالی منگوا کر پی اور جب افیون نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا تو ترنگ میں آ کر دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے اپنے غلام کو آواز دی ـــــ "بدنصیب غلام! کیا تیری دانست میں خدا کا وجود ہے؟"

غلام نے "جی ہاں" کہکر جاری سے کمر میں سے ایک چھوٹی سی گڑیا نکالی اور کہا۔ "دیکھئے یہی میرا خدا ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، ہمارے ملک میں ہر شخص فنایش کے درخت کی پوجا کرتا ہے۔ کیونکہ ہمارے خدا کو اسی لکڑی سے بنایا گیا ہے، ہم اسی سے مدد مانگتے ہیں اور اسی سے مرادیں پاتے ہیں۔"

ایرانی عالم اور اس کے غلام کی گفتگو سے قہوہ خانہ والوں کو حیرت ہونے لگی۔ خاص کر مالک کے سوال اور غلام کے جواب سب کے لئے باعث حیرت تھے۔

ایک برہمن نے جو قریب ہی بیٹھا تھا غلام سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سیاہ رو دیوانے! کیا تیرا یہ عقیدہ ہے کہ خدا کو کمر سے باندھ کر جہاں چاہیں لے جا سکتے ہیں؟ سُن! خدا ایک ہے یعنی برہما اور وہ تمام دنیا سے بڑا ہے۔ وہ ایسا باجبروت ہے کہ اس کی پرستش کے لئے گنگا کے کنارے بڑے بڑے مندر بنائے گئے ہیں اور ہزارہا برہمن اس کی پوجا کرتے ہیں وہ خدا وند حقیقی کو پہچان چکے ہیں، ان کے سوا کسی نے پہچانا ہی نہیں ہزارہا سال گزر گئے، کروڑوں انقلاب ہوئے مگر یہ برہمن اسی طرح برہما کی پرستش کئے جا رہے ہیں یہی صراط مستقیم و راہ راست ہے۔"

برہمن نے اپنی گفتگو ختم کر کے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا وہ چاہتا تھا کہ لوگ بھی اس کے خیالات سے متاثر ہوں اور اس کی ہاں میں ہاں ملائیں مگر ایک یہودی دلال نے اس سے مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا "خدا نے

حقیقی کا معبد ہندوستان میں نہیں ـــــ خدا برہمنوں کا پروردگار نہیں بلکہ خدائے ابراہیمؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ خدائے عالم ہے وہ اسرائیلیوں کے سوا کسی اور قوم سے محبت نہیں کرتا، ابتدائے آفرینش سے اب تک یہی قوم اسکی محبوب ہے، ہم دنیا میں منتشر اور آوارہ ہیں اور محض اسلئے کہ اسے ہمارا امتحان مقصود ہے، اس نے خود وعدہ کیا ہے کہ ملت حنیف کو بیت المقدس میں جمع کر دے گا۔ اس وقت یروشلم کے ہیکل جو منجملہ عجوبہ روزگار ہیں کمال عزت و عظمت سے کھڑے ہیں، بنی اسرائیل ہی دنیا پر حکومت کرینگے اور زمام امور عالم انہی کے ہاتھ میں ہوگی، ان کی عزت دنیا میں بڑھے گی، دوسرے لوگ ذلیل و خوار ہونگے۔"

یہودی نے یہ کہکر رونا شروع کر دیا اور رونا ختم کرکے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک اطالوی پادری نے قطع کلام کرکے کہا ـــــ "تم نے غلط کہا بالکل غلط، تم خدا کو بے انصافی اور ظلم سے نسبت دے رہے ہو، ممکن نہیں کہ خدا تمہاری قوم کو دوسری اقوام سے زیادہ عزیز رکھے، ہو سکتا ہے کہ اسرائیلی کسی زمانے میں خدا کے عزیز رہے ہوں مگر اب ایک ہزار نوسو سال سے وہ خدا کے غضب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان پر عذاب نازل ہو رہا ہے، بزرگی و برتری سب سلب کر لیگئی ہے، شیرازۂ قومیت بکھر گیا ہے اور اسرائیلی ذلت و خواری میں مبتلا ہیں۔ خداوند جس کو قرب عطا کرنا چاہتا ہے۔ اسے راہ راست دکھاتا ہے، ہمارا کلیسہ مظہر لطف و کرم اور منبع رحم و مغفرت ہے جو اس سے دور ہو وہ بدبخت ہے۔"

اطالوی یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک پروٹسٹنٹ نے جو وہاں بیٹھا تھا غضب ناک ہو کر کہا "تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ فقط کیتھولک سیدھے راستے پر ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ صرف تمہارا طریقہ ہی صحیح ہے درا صل یہ غلط ہے تم کس بنا پر ایسا کہہ سکتے ہو؟ فقط وہ لوگ بخشے جا سکتے ہیں جو انجیل مقدس پر عمل پیرا ہوں۔ خداوند کی عبادت اور اس کی کتاب پر عمل کریں۔"

ایک ترک جو کسی عہدے پر مامور تھا اور بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا، دونوں عیسائیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا "اب تمہارا عقیدہ باطل اور درجۂ اعتبار سے ساقط ہو چکا ہے، کیونکہ آج سے بارہ سو سال پہلے دین مبین سید المرسلین رحمۃ اللعالمین آ چکا ہے۔ تمام سابقہ مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں اگر چشم انصاف ہے تو دیکھو کہ دین حنیف اسلام تمام اقطاع یورپ و ایشیا حتےٰ کہ چین تک پھیل گیا ہے جو لوگ صاحب عقل و تمیز ہیں وہ اس مذہب کو قبول کر چکے ہیں، تم خود کہتے ہو کہ خداوند عالم نے یہودیوں کو مردود کر دیا اور وہ دوسروں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو چکے ہیں لیکن دین اسلام ترقی کر رہا ہے، کوئی شخص پیروانِ محمدؐ عربی کے سوا بخشا نہ جائیگا اور مسلمانوں میں سے بھی فقط اہل السنت والجماعت آتش دوزخ سے نجات پائینگے شیعوں کو یہ بات نصیب نہ ہوگی، کیونکہ وہ صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں"

ایرانی عالم جو شیعہ تھا کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ تمام لوگ جو مختلف مذاہب و معتقدات کے تھے یکا یک چیخ پکار کرنے لگے، تبت کے لاما، اسمٰعیلی (حسن بن صباح کے پیرو)، آتش پرست (پارسی) آپس میں لڑنے لگے۔

ہر ایک اس خیال پر اَڑا ہوا تھا کہ ہمارا مذہب سب مذاہب سے اچھا ہے۔ اور ہر فرقہ یہ چاہتا تھا کہ چیخ پکار اور فریاد و فغاں سے اپنی سچائی ثابت کرے۔

ایک چینی جو کنفیوشس کا پیرو تھا ایک کونے میں خاموش بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ترک نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جناب چینی! تم میری تصدیق کروگے؟ اگرچہ تم خاموش الگ تھلگ بیٹھے ہو مگر یقین ہے کہ تمہاری رائے صحیح ہوگی۔ تمہارے ہموطن مجھ سے جب کبھی ملتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ ممالکات چین میں تمام مذاہب رائج ہیں۔ مگر چینی لوگ اسلام کو سب مذاہب سے اچھا اور سچا مذہب سمجھتے ہیں تم کہو تمہاری رائے کیا ہے؟"

اور لوگوں نے بھی بیک زبان کہا: "ہاں، ہاں، ان کی رائے دریافت کرو۔"

چینی نے آنکھیں بند کر کے غور و فکر شروع کیا۔ پھر آنکھیں کھول کر بڑی بڑی آستینوں سے ہاتھوں کو باہر نکال کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور نہایت نرم و لطیف لہجہ میں کہا:۔

"حضرات! میری ناچیز رائے میں ان تمام جھگڑوں اور لڑائیوں کی اصل وجہ لاعلمی اور جھوٹا غرور و تکبر ہے، کہو تو ایک حکایت سنا دوں ــــ میں ایک ایسے جہاز میں سوار ہوا تھا جو دنیا کا چکر کاٹتے ہوئے چین پہنچا تھا۔ وہاں سے چل کر یہ جہاز پانی لینے کے لیے جزیرہ سماٹرا میں ٹھہرا۔ ہم نے تفریحاً خشکی پر اُتر کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ بعض لوگ ساحل پر نارجیل کے درختوں

کے نیچے بیٹھ گئے۔

مختلف ممالک و مذاہب کے لوگ تھے اتفاق سے ایک اندھا بھی ہمارے پاس آ گیا۔ وہ پیدائشی اندھا نہ تھا بلکہ آفتاب کو گھور گھور کر اس کی ماہیت سے واقف ہونے کے جنون میں آنکھیں کھو بیٹھا تھا اور اس کو ساری دنیا سیاہ نظر آنے لگی تھی، اس کا خیال تھا کہ نورِ آفتاب مائع نہیں کیونکہ اگر مائع ہوتا تو ہم اسے ایک برتن سے دوسرے برتن میں منتقل کر سکتے تھے اور وہ ہوا کے تموّج سے پانی کی طرح ہلتا نظر آ سکتا تھا ــــ آگ بھی نہیں، آگ ہوتا تو پانی نے اسے کبھی کا سرد کر دیا ہوتا ــــ روح بھی نہیں، کیونکہ آنکھیں اسے دیکھ سکتی ہیں اور نہ مادہ ہی ہے کیونکہ اس میں نمو کی قوت نہیں۔ بہر حال آفتاب کی روشنی نہ تو روح ہے نہ مادہ، مختصر یہ کہ کچھ بھی نہیں۔ یعنی اس کا خارجی وجود کچھ بھی نہیں۔ وہ ایسی ہی باتیں کہتا تھا۔ چونکہ آفتاب کو گھورتے گھورتے اس کی آنکھیں اندھی ہو گئی تھیں اور عقل بھی زائل ہو چکی تھی اس لئے اسے یقین ہو گیا تھا کہ آفتاب کا وجود نہیں ــــ اندھے کا غلام، آقا کو نارجیل کے درخت کے سائے میں بٹھا کر خود نارجیل کے پھل کا چراغ بنانے لگا۔ غلام تو اس کام میں مصروف تھا اتنے میں اس کے اندھے آقا نے ایک آہِ سرد کھینچ کر کہا:۔

" اے غلام، جس وقت میں نے کہا تھا کہ آفتاب کا وجود نہیں ہے تو تجھے یقین نہیں آیا تھا اب دیکھ کس قدر تاریکی ہے، اس کے باوجود لوگ کہتے ہیں، کہ آفتاب ہے اور اپنی ضیا باری سے جہان کو منور کرتا ہے۔"

غلام نے جواب دیا "مجھے کچھ بھی نہیں معلوم اور نہ یہ باتیں میری سمجھ میں آتی ہیں، میں نہ نور روشنی کو سمجھ سکتا ہوں نہ تاریکی کو۔"

یہ کہتے ہوئے اس کالے کوسے (غلام) نے نارجیل بلند کر کے کہا:۔

"آفتاب میرے لئے یہی ہے، اس کی مدد سے میں رات کو بھی دیکھ سکتا ہوں"۔

ایک لنگڑے شخص نے جو راستے سے جاتے ہوئے ٹھہر گیا تھا، یہ سن کر کہا "معلوم ہوتا ہے تو عمر بھر اندھا ہی رہا۔ آفتاب اور نور کی پہچان تک تجھے نہیں، سن میں بتاتا ہوں، آفتاب ایک گوشہ نشین ہے، ہر صبح سمندر سے نکل کر شام کو ہمارے جزیرے کے پہاڑوں میں چلا جاتا ہے، میں نے بچشم خود دیکھا ہے اگر تیری بھی آنکھیں ہوتیں تو دیکھ سکتا تھا۔"

ایک ماہی گیر نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب ہمارے جزیرے کے پہاڑوں میں داخل نہیں ہوتا بلکہ جس طرح سمندر سے طلوع ہوتا ہے اسی طرح شام کو سمندر ہی میں غروب ہو جاتا ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل صحیح ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

ایک ہندوستانی نے جو ہمارے ساتھ تھا کہا "تعجب ہے کہ کیسی بیوقوفی کی باتیں کر رہے ہو اور کتنا جھوٹ بول رہے ہو "گوشہ نشین" پانی میں کس طرح جا سکتا ہے اگر وہ پانی میں ڈوبے تو بجھ جائے۔ آفتاب گوشہ نشین نہیں بلکہ دیوتا ہے جو رتھ میں بیٹھ کر کوہ طلائی یعنی سمیرو کے گرد گھومتا ہے بعض وقت راہو اور کیتو جیسے نحوس افعی اس پر حملہ کرتے ہیں اور اس پر چھا جاتے ہیں، اس وقت دنیا تیرہ و تار ہو جاتی ہے تو لوگ جنتر منتر پڑھ کر

اس کو آزاد کراتے ہیں بعض جاہل جو مکڑی کی طرح اپنے تانے بانے کے باہر کا حال نہیں جانتے اور جزیرے سے باہر قدم نہیں نکالتے، یہ سمجھتے ہیں کہ سورج فقط انہیں کے جزیرے میں طلوع ہوتا ہے اور ان کے سوا کسی کو اپنے نور سے بہرہ مند نہیں کرتا ع :-

زہے تصوّرِ باطل زہے خیالِ محال

مصری کشتی کا ناخدا جو قریب ہی کھڑا تھا کہنے لگا:"نہیں، نہیں، آپ بھی حقیقت سے واقف نہیں ہیں میں نے دریائے احمر میں سفر اور سواحل عرب پر مقام کیا ہے بڑے بڑے ملک دیکھے ہیں، آفتاب تمام دنیا پر چمکتا ہے مشرق اقصیٰ کے عقبی جزیرے سے طلوع ہوتا ہے، اسی لئے جاپانی اپنے ملک کو آفتاب کا مولد خیال کرتے ہیں، میں نے اپنے مرحوم دادا کو یہی کہتے سنا ہے... جو تقریباً تمام دریاؤں کا سفر کر چکے تھے۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ایک انگریز ملاح نے بات کاٹ کر کہا:"کسی ملک کے باشندے بھی انگلستان کے باشندوں کی طرح آفتاب کے طلوع و غروب سے واقف نہیں۔ کیونکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ آفتاب نہ کہیں سے طلوع ہوتا ہے اور نہ کسی جگہ غروب ہوتا ہے بلکہ دنیا کے گرد گھومتا ہے۔ مجھے بھی اس کا یقین ہے کیونکہ میں نے بھی دنیا کے گرد سفر کیا ہے اور کہیں بھی آفتاب سے متصادم یا متعارف نہیں ہوا۔ جہاں پہنچا آفتاب کو اسی طرح دیکھا جس طرح اب نظر آتا ہے۔"

یہ کہکر انگریز نے ایک لکڑی کے ٹکڑے سے چند دائرے کھینچے اور

آفتاب کی گردش معلوم کرنی چاہی جب سمجھ میں نہ آیا تو اپنے جہاز کے معلم کی طرف اشارہ کرکے کہا "یہ شخص مجھ سے زیادہ اس کا ماہر ہے اور اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کر سکتا ہے۔"

معلم ایک ذی فہم آدمی تھا اور اس گفتگو کو کان لگا کر سن رہا تھا جب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تو وہ کہنے لگا:۔

"تم ایک دوسرے کو قعرِ ضلالت میں پڑا ہوا سمجھتے ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ تم غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ آفتاب زمین کے گرد نہیں گھومتا بلکہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے، اور ہر چوبیس گھنٹے میں آفتاب کے گرد ایک چکر لگاتی ہے یہ حالت نہ صرف جاپان، فلپائن اور سماٹرا میں ہوتی ہے بلکہ افریقہ، یورپ، امریکہ اور سب ملکوں میں یہی حال ہے، آفتاب صرف ایک پہاڑ، ایک دریا، ایک جزیرہ یا ایک شہر کی حد تک اپنا نور نہیں پھیلاتا بلکہ ساری دنیا کو منور کرتا ہے، اگر تم اس زمین کو جس پر کھڑے ہو، دیکھو اور پھر آسمان کی جانب غور کرو تو یہ حقیقت واضح ہو جائیگی، پھر کبھی یہ نہ سمجھو گے کہ سورج صرف تمہارے اور تمہارے وطن کے لئے نور افشانی کرتا ہے۔"

یہ داستان سنا کر کنفیوشس کے پیرو چینی نے کہا "صرف غرور ہی کی وجہ سے انسان میں اختلاف و نفاق پیدا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ مفلوک اور بدحال ہو رہے ہیں۔ ہماری بدبختی صرف یہی ہے اور آدمیت کی بنیاد اس نخوت ہی کی وجہ سے ہل رہی ہے، نہ صرف آفتاب کے متعلق یہ مغرور مختلف خیالات رکھتے ہیں، بلکہ ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق بھی مختلف عقاید و مسالک

پیدا ہوگئے ہیں اور ہر شخص چاہتا ہے کہ خدا کو اپنے وطن اور اپنے شہر کی حد تک محدود کر دے۔

ہر قوم یہ چاہتی ہے کہ اس ذات کو جس میں سینکڑوں عالم سمائے ہوئے ہیں اپنے معابد میں محبوس کر لے اور دوسروں کو اس فیضِ وجود سے محروم بنا دے۔ کیا کوئی معبد اس ہیکل کا مقابلہ کر سکتا ہے جسے خداوندِ عالم نے بنایا ہے تاکہ تمام انسان ایک دین اور ایک مذہب پر متفق ہو جائیں اور ان کو جادۂ نفاق و شقاق سے ہٹائے؟

دنیا کے تمام معابد اسی ہیکل کی وضع کے بنائے گئے ہیں، ہر ایک ہیکل پر چشمہ، قربان گاہ، سقف، چراغ، تصاویر، مجسمے، کتبے وغیرہ اسی طرح بنائے گئے ہیں۔ مگر اس کے سے چشمے، اس کے سے فانوس، اس کا سا سقف (یعنی آسمان کا سا) اور چراغ (آفتاب کا سا) کسی معبد میں بھی نہیں

بہر حال نہ تو اس ہیکل جیسی چیزیں ہی کہیں ہیں اور نہ ایسے آئین و قوانین بنائے جا سکتے ہیں، نہ اس کی سی قربانی کی جا سکتی ہے اور نہ فداکاری!

علم انسانی جس قدر بڑھتا ہے اسی قدر ذاتِ باری کو انسان اچھی طرح سمجھنے لگتا ہے اور جتنا سمجھتا ہے اتنا ہی نزدیک ہوتا جاتا ہے اور جس قدر نزدیک ہوتا جاتا ہے اتنا ہی لطف و کرم اور شفقت و دوستی کا خوگر ہوتا جاتا ہے۔

جو شخص آفتابِ عالمتاب کو اچھی طرح جانتا اور دیکھتا ہے، اس کے لئے مناسب نہیں کہ فقط ایک شعاعِ نور اپنے ہی "بُت" میں دیکھے اور دوسروں کی تحقیر کرے۔ اس شخص کو بھی جو اندھا ہو اور آفتاب کو دیکھ

نہ سکتا ہو یہ نہیں چاہیئے کہ تحقیر و تذلیل کرے، انسان کو چاہیئے کہ ایکدوسرے سے اتحاد پیدا کرے۔ اتفاق سے مصائب زندگی کا مقابلہ کرے اور دُنیا کو ایک جنت بنا دے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ مذہبی اختلافات کو چھوڑ کر انسانی دوستی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں"

چینی کی تقریر سن کر سب لوگوں نے جو قہوہ خانہ میں بیٹھے تھے سر جھکا لئے اور ایک خاموشی چھا گئی۔ اس کی گراں بہا نصیحت سن کر کسی نے بھی نزاع کی ہمت نہیں کی کہ کون سا دین حق ہے اور کون سا باطل ؎

نہیں دَیر و حرم کی قید، اہلِ دل کو یزدانی!
وُہی ہے گھر خدا کا بیٹھ کر سجدہ جہاں کر لیں

غربت انسان کا سب سے بڑا گناہ ہے
اور گناہ مجبوری کا دوسرا نام ہے

"گناہِ غربت"

—— میں روس کے مفکرِ اعظم مہاتما ٹالسٹائی نے سوسائٹی کی اس دُکھتی رگ پر نشتر رکھا ہے

گناہِ غربت

ٹالسٹائی کے دو دلنشیں افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں "افلاس و گناہ" اور "سرمایہ و گناہ" کے دوگونہ پہلو کو بے باکانہ انداز میں عریاں کر کے دکھایا گیا ہے۔

گناہِ غربت

ہندوستان کے جواں فکر ادیب حضرت یزدانی جالندھری کی مترجمانہ قابلیت کا بہترین نمونہ ہے۔ ضخامت دو کتابی صفحات۔ کاغذ اعلیٰ اور بہترین کتابت و طباعت —— قیمت مجلد سنہری صرف ایک روپیہ چار آنے۔

ملنے کا پتہ

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور

کملا

بنگالی زبان کے ایک مشہور ناول "بارہ واری" کا اُردو ترجمہ

آہوں، آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا طوفان۔ عشق کی جنوں سامانیاں اور حسن کی کافر ادائیاں اگر دیکھنی مطلوب ہوں تو اس ناول کو ملاحظہ فرمایئے!

بنگالی زبان کا یہ مشہور ناول بنگال کے بارہ مشہور مصنفین کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ہر مصنف نے اس کے مختلف باب لکھے ہیں، یہ کتاب عشق و محبت کی ایک رنگین داستان ہے۔ اگر ایک مرتبہ آپ اسے شروع کریں گے تو جب تک ختم نہ کر لیں گے آپ کو چین نہیں آئیگا۔

یہ وُہ ناول ہے جس پر بنگالی ادب کو ناز ہے۔ اس کا ترجمہ ملک کے مشہور ادیب اور شاعر راجہ مہدی علی خاں صاحب نے کیا ہے۔

نفیس کاغذ ـــــ شاندار گیٹ اپ ـــــ قیمت مجلد کتاب عہ

غریبوں کا بہشت

اور دیگر افسانے

یہ کتاب ہندوستان کے مختلف صوبوں کے گیارہ نامور افسانہ نگار
دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ہندی، تلیگو، تامل، بنگالی، کناڑی، مرہٹی اور گ
کے بہترین افسانہ نگاروں کے بہترین افسانے منتخب کر کے اس کتاب میں ا
کیے گئے ہیں۔ افسانے کیا ہیں ؛ ہندوستانی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویریں
"غریبوں کا بہشت اور دیگر افسانے" پڑھ کر عشق کی جانگدازیوں
کی ستم شعاریوں اور جوانی کی تباہ کاریوں کا ایک رونگٹے کھڑے کر دینے و
دیکھئے۔ ایسی دلچسپ اور رنگین کتاب آپ نے اس سے پہلے نہ پڑھی ہوگی
افسانوں کا ترجمہ ہمارے صوبے کے مقتدر ادیب جناب آتش گو
نے کیا ہے۔ اور دیباچہ ملک کے مشہور شاعر و ادیب جناب راجہ مہدی
خان صاحب نے لکھا ہے۔

کاغذ نفیس، لکھائی چھپائی دیدہ زیب کتاب مجلد قیمت صرف ع

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ